مذاکرات

مجلسِ مذاکرہ علمیہ کے یکسالہ مضامین

سنہ ۴۴ و ۴۳ ۱۳ھ

۲۵ ۱۹ء

حسبِ ایماء

جنابِ معتمد صاحبِ مجلسِ مذاکرہ

دارالطبع جامعہ عثمانیہ سرکارِ عالی میں طبع ہوا

فہرست

باسمہ تعالیٰ

تاج المآثر

(تبصرہ: از سید ہاشمی فرید آبادی رکن دار الترجمہ)

تاج المآثر مسلمانوں کی فتوحاتِ ہند اور سلطنت دہلی کی سب سے پہلی تاریخ اور مسلمانوں کے ہندوستان خاص پر تسلط حاصل کرنے کے بعد کی سب سے پہلی تصنیف ہے جو پائے تخت دہلی میں لکھی گئی۔ شہر دہلی کو پرتھی راج کی شکست کے ایک سال بعد ۵۸۹ھ میں مسلمانوں نے اپنا مستقر بنا لیا تھا۔ لیکن سلطان شہاب الدین غوری کی زندگی تک دہلی کی حیثیت محض ایک صوبے کے صدر مقام کی سی رہی اور یہ امر بھی یقینی نہیں ہے کہ آیا شروع شروع میں تھنکر (بیانہ) اور کول (علی گڑھ) وغیرہ مقامات کے صوبہ دار دہلی کے والی قطب الدین ایبک کے ماتحت بھی تھے یا نہیں۔ البتہ ۶۰۲ھ میں جب سلطان شہاب الدین غوری ملاحدہ اسمٰعیلیہ کے ہاتھ سے جہلم کے کنارے شہید ہوا تو قطب الدین ایبک ممالک ہند کا خود مختار بادشاہ ہو گیا اور دہلی ہندوستان کی سب سے پہلی آزاد سلطنت کا صدر مقام بن گئی۔ ظاہراً اسی زمانے میں دہلی اور دہلی کے نئے بادشاہ کی ایک علیحدہ تاریخ لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ خدمت نیشاپور کے نووارد ادیب نظام الدین حسن نظامی کے سپرد کی گئی۔ سلطان شہاب الدین غوری کا انتقال پہلی یا تیسری شعبان ۶۰۲ھ کو ہوا تھا شاید اسی بنا پر الیٹ نے قیاس کیا ہے کہ تاج المآثر کی تالیف کا آغاز ماہ شعبان ۶۰۲ھ میں کیا گیا۔ ورنہ جو

قلمی نسخہ میرے سامنے ہے اس میں صرف "در شہور سنہ اثنی وستمایۃ" تحریر ہے۔

تاج المآثر میں تاریخی واقعات کو دوسری جنگ ترائن سے شروع کیا ہے جو فی الواقع تمام ہندوستان کی فتح کی سر آغاز ثابت ہوئی۔ اور عام نسخوں میں ۶۱۴ھ تک کے حالات ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر، یہ کل ۲۶ برس کے مقامی واقعات کی تاریخ ہے اور چونکہ مصنف خود پایۂ تخت دہلی میں موجود اور سربرآوردہ لوگوں سے میل جول اور واقعات کی تحقیق و تلاش کے بہترین مواقع رکھتا تھا، اسلئے خواہ مخواہ خیال ہوتا ہے کہ تاج المآثر اس عہد کی سب سے مفید و مستند تاریخ ہوگی۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے بلکہ کتاب لکھنے سے مصنف کا مقصد صرف بادشاہ کی مدح سرائی اور اپنی انشا پردازی کے کمالات کا اظہار کرنا ہے۔ واقعاتِ تاریخی کی تحقیق و تفصیل پر وہ چنداں اعتنا نہیں کرتا اور بہ حیثیت تاریخ اس کی ضخیم کتاب، تشنہ اور ناقص ہے۔

اُس زمانے کی تاریخوں میں تاج المآثر کے گمنام و غیر معروف ہونے کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ ورنہ اسلامی تاریخ میں بلکہ خود دنیا کی تاریخ میں مسلمانوں کا شمالی ہندوستان کو فتح کرنا اور یہاں ایک آزاد اسلامی سلطنت کا قائم ہونا۔ بہت بڑا واقعہ ہے۔ چنانچہ اس عہد کی لکھی ہوئی دوسری تاریخ طبقات ناصری ہمیشہ سے اہل تاریخ میں مقبول و متداول رہی حالانکہ وہ تاج المآثر سے پچاس برس بعد لکھی گئی اور ہندوستان کے متعلق اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب ملاکر ضخامت میں تاج المآثر کے نصف حصّے کے برابر بھی نہیں ہے۔ برخلاف طبقات ناصری کے ہم دیکھتے ہیں کہ تاج المآثر اور اس کے مولّف کا ہمعصر تصانیف میں تو کہیں ذکر ہی نہیں آتا اور بعد کی کتابوں میں بھی بہت سرسری حوالہ دیا گیا ہے۔ کشف الظنون میں آدھی سطر میں اس کا ذکر ہے اور اس میں اور روضۃ الصفا میں مصنف کا نام غلطی سے "صدر الدین" تحریر کر دیا ہے۔ تاریخ گزیدہ کی آخری فصول میں۔ یہ دلچسپ اطلاع درج ہے کہ نظامی صاحب تاج المآثر مشہور

شاعر و ادیب، نظامی عروضی (سمرقندی) کا فرزند تھا۔ (گزیدہ۔ مطبوعہ لندن۔ صفحہ ۸۲۶) لیکن فاضل موّرخ نے جہاں اپنی "تاریخ گزیدہ" کے ماخذ گنوائے ہیں اُن میں تاج المآثر کو داخل نہیں کیا۔ قریب تر زمانے میں، نظام الدین بخشی اور ابو القاسم فرشتہ، تاج المآثر کا ذکر کرتے ہیں اور موجودہ نسخوں کے سنین کتابت دیکھنے سے قیاس ہوتا ہے کہ عہد اکبری میں یہ کتاب خاصی مقبول تھی۔

زمانۂ حال میں، سب سے پہلے جرمن مستشرق ہیمر نے اپنی کتاب گمال ڈسآل میں تاج المآثر پر ایک مختصر تبصرہ لکھا جس میں غلطی سے مصنّف کو "لاہوری" بتایا گیا ہے۔ میجر لیس (ال ال ڈی) نے ہندوستان کی تاریخوں پر ایک مضمون میں تاج المآثر کا ذکر کیا ہے (رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی لنڈن ماہ جنوری ۱۸۶۸ء) اور ان کا ارادہ تھا کہ تاج المآثر کو چھپوا دیا جائے مگر یہ ارادہ پورا نہیں ہوا۔ آخر میں سر ہنری الیٹ نے اپنی مشہور تاریخ ہند کی دوسری جلد میں تاج المآثر پر تبصرہ اور اس کے تھوڑے سے حصّے کا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔

سر ہنری الیٹ کو تلاش کے باوجود تاج المآثر کے صرف چند نسخوں کا پتہ چلا۔ اور وہ اسے بہت کمیاب سمجھتے تھے لیکن چند سال بعد جب میجر راورٹی نے ۱۸۸۰ء میں طبقات ناصری کا ترجمہ شروع کیا تو اُن کے سامنے تاج المآثر کے بھی چار نسخے تھے اور اب بھی یورپ کے کتاب خانوں میں اس کتاب کے کئی نسخے موجود ہیں جن میں برٹش میوزئم کا ایک نسخہ سب سے قدیم یعنے ۱۱ھ؟ کی کتابت ہے۔

کتاب کے عام نسخوں میں جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ۵۸۷ھ سے ۶۱۴ھ تک کے حالات ملتے ہیں۔ لیکن سر ہنری الیٹ کا بیان ہے کہ نواب ضیاء الدین خاں دہلوی کے کتاب خانے میں جو نسخہ انھوں نے دیکھا اس میں ۶۲۶ھ یعنے سلطان شمس الدین التمش کی وفات کے دو سال قبل تک کے واقعات درج تھے۔ اس نسخے کا اب پتہ نہیں چلتا کہ کہاں گیا۔ لیکن اگر سر ہنری کا قول

صحیح ہو تو بھی سچ یہ ہے کہ کتاب کا اصلی موضوع سلطان قطب الدین ہی کے کارنامے ہیں اور اسکے انتقال کے بعد مصنّف نے جو کچھ لکھا ہے اس میں وہ ذوق شوق اور اہتمام نہیں پایا جاتا جو قطب الدین کے حالات لکھنے میں کیا گیا ہے۔

دوسرے نسخوں کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے زیر نظر کتب خانہ آصفیہ کے نسخے اور یورپ کے نسخوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ ہمارا نسخہ متوسط تقطیع کے (۱۹ سطر فی صفحہ کے) ۶۲۷ صفحات پر مشتمل ہے اور ہیمر کے نسخے کی مثل اس کی بھی کل سطریں تقریباً بارہ ہزار ہیں جن میں سے سات ہزار کے قریب صرف اشعار ہیں ہمارے نسخے میں کہیں کہیں الفاظ چھوٹ گئے ہیں اور کتابت کی اکثر غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ کتابت کا سنہ کہیں درج نہیں لیکن لکھا ہے کہ یہ نسخہ صدر الملتہ والحق مولانا محمد بن محمد المحوبتی کے نسخے سے نقل کیا گیا ہے اور کتاب کے آخر میں انہی صاحب کی تقریظ بھی درج ہے اور مجھے خیال ہوتا ہے کہ شاید اسی تقریظ نگار کے نام سے حاجی خلیفہ کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ مولّف کتاب کا نام صدر الدین سمجھا کیونکہ جیسا کہ الیٹؔ نے لکھا ہے یہ تقریظ بہت قدیم نسخوں میں بھی موجود ہے۔ فاضل تقریظ نگار نے مولف کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں لیکن افسوس ہے اس کی ولادت وفات یا حالاتِ زندگی کے متعلق کوئی کار آمد بات نہیں لکھی۔

دوسری کسی متداول تاریخ یا تذکرۂ شعرا میں مصنّف کا نام نظر نہیں آتا حالانکہ اس کے اعلیٰ درجے کے ادیب اور قادر الکلام شاعر ہونے کے ثبوت میں تاج المآثر کا پیش کر دینا کافی ہے۔ اور اسی کتاب میں جا بجا اس نے مختلف مضامین کے جو شعر لکھے ہیں انہیں جمع کیا جائے تو بہت خاصا مجموعہ مرتب ہو سکتا ہے۔ بہر حال اس کے ذاتی حالات سے قطع نظر کر کے ہمیں اصل کتاب پر ایک نظر ڈالنی چاہیئے جس کے ابتدائی حصّے میں مصنّف نے مختصر طور پر اپنا حال

بھی لکھا ہے کہ وہ کس طرح نیشا پور سے دہلی پہنچا۔

حمد و نعت کے بعد مصنّف نے "افتتاح سخن" کے عنوان سے جہاد کی ضرورت پر تقریر کی ہے کہ "اگرچہ ..... مناظم احوال عالم بے واسطہ قلم محال باشد امّا تا بہ تیغ قواعدِ دولت و ارکان ملک استوار کردہ نیاید ... احکامِ معدلت و قوانین انصاف بر رعایا و زیر دستاں کہ ودائع آفریدگار جلّت قدرتہ اند احکام نہ پذیرد ... و بہ ہیچ وجہ قلم فتویٰ ارباب علم را کہ میراث دارانِ شرع نبوی اند فرو شکوہ پیدا نہ آید۔ و عقلا از جہتِ ایں معنی گفتہ اند ؎

ملک را چوں قرار خواہی داد — تیغ را بیقرار باید کرد"

اسی سلسلے میں مولف قطب الدین ایبک کی جنگجوی اور کشورستانی اور ہندوستان جیسے دارالکفر میں اس کی جلیل القدر اسلامی خدمات کی بڑی شدومد کیساتھ مدح و ستائش کرتا ہے کہ:۔

"از تیغ او بجائے صلیب و کلیسیا — در دارِ کفر مسجد و محراب و منبر است

آنجا کہ بُود نعرہ و فریاد مشرکاں — اکنوں خروش و نعرہ اللہ اکبر است"

پھر مصنّف قطب الدین کے عدل و انصاف اور سخاوت و دریا دلی کی تعریف کے بعد "شرح حال مرتّب ایں مجموع" کے عنوان سے اپنے متعلق لکھتا ہے کہ "بندہ و بندہ زادہ حسن نظامی" اپنا تذکرہ کرنا نہ چاہتا تھا لیکن رہا نہ گیا اور مختصر طور پر اپنی عبرت ناک سرگذشت عرض کرتا ہوں کہ جب خراسان میں ہل چل ہوئی اور اہل معنے کی طرف التفات کم ہو گیا تو میں نے وطن سے باہر جانے کا ارادہ کیا" و در طلب مقصود با دوستان پند پذیرہ عذر مسیر تقریر کرد" لیکن پہلی دفعہ احباب کے کہنے سننے سے وہ رک گیا اور ایک عرصے تک انتظار کرتا رہا کہ خراسان کی حالت بہتر ہو جائے مگر فتنہ و فساد بڑھتا گیا اور خانگی آلام و افکار نے مصنّف کو اس درجہ پریشان کیا کہ وہ فی الواقع رو دیا اور آخر کار اس سے قبل کہ جوانی "کہ موسم عیش و تمتّع است نہایت پذیرد" اس نے

ترکِ وطن کی ٹھان لی اور یہ سمجھکر کہ ؎

مردم بہ شہر خویش ندارد بسے خطر — گوہر بکان خویش ندارد بسے بہا

وہ اپنے شیخ (؟) مولانا محمد کوفی کے مشورے سے غزنی روانہ ہوگیا۔

مصنف نے خراسان کی ہل چل کا اجمالی طور پر اشارہ کیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس سے مراد ۵۵۰ھ کے بعد کا وہی زمانہ ہوسکتا ہے جس میں سلطان سنجر کی قبائل غز سے شکست اور وفات کے بعد خراسان میں پچیس تیس برس تک طوائف الملوکی اور بدنظمی رہی۔ قیاس چاہتا ہے کہ ہمارے مصنف کی ولادت بھی چھٹی صدی کے اسی وسطی زمانے میں ہوئی اور چھٹی صدی کے آخری سنین میں جب وہ اپنا وطن چھوڑ کر غزنی روانہ ہوا ہے تو اس کی عمر کم وبیش چالیس سال کی تھی۔ کیونکہ اس کے باپ نظامی سمرقندی کی مشہور و معروف کتاب چہار مقالہ سے اتنا ہیں یقینی طور پر معلوم ہے کہ ۵۵۰ھ ہی میں نظامی کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز ہوچکی تھی۔ اس جگہ ضمناً یہ بیان کردینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ گو نظامی سمرقندی کا اصلی وطن سمرقند تھا اور وہ سلاطین غور کی سرکار میں ملازم ہوگیا تھا لیکن اس کی آمد و رفت برابر نیشاپور میں رہتی تھی اور ہمارے مصنف کے حالات سے نتیجہ نکلتا ہے کہ آخر میں نیشاپور ہی اس کا گھر بن گیا تھا اور اس کے اہل وعیال یہیں سکونت رکھتے تھے؛

مصنف کے غزنی آنے کا زمانہ وہ ہے جب کہ قبائل غز کے قبضہ سے چھین کر غوریوں نے اس شہر کو اپنا مستقر بنایا تھا اور سلطان معز الدین (یا شہاب الدین) غوری کی اقبالمندی اُمید دلاتی تھی کہ اس کے چچا نے جس پائے تخت کو جلا کے خاک کردیا تھا وہ دوبارہ اسے معمور و بارونق بنا دیگا لیکن سلطان معزالدین جس طرح ملک گیری اور اوصاف سپہ سالاری میں سلطان محمود سے کمتر ہے اسی طرح تعمیر و تنظیم بلاد میں بھی اس کا ہم رتبہ نہ تھا۔ ہمارے مصنّف کو تھوڑے عرصے کے بعد

مصلحت اسی میں نظر آئی کہ غزنی کو خیر باد کہے اور " بہ شہر دہلی کہ خطہ کرم و قبلہ نعم است" کا رُخ کرے۔
مصنّف نے خراسان سے ترک وطن یا غزنی سے اپنی روانگی کی کوئی تاریخ نہیں لکھی مگر ظاہر ہے کہ اس کا ہندوستان کے جدید اسلامی صدر مقام کو روانہ ہونا، فتح دہلی یعنے ۵۸۹ھ کے بعد کا واقعہ ہے۔

سفر ہندوستان کا مصنّف نے شاعرانہ پیرایہ میں بہت دلچسپ حال لکھا ہے۔ وہ ایک تیز رفتار گھوڑے پر سوار بڑی بڑی منزلیں طے کرتا ہوا روانہ ہوا۔ لیکن شروع سفر میں نہایت ناہموار زمین سے گزر ہوا۔ راستے کے وہ غیر معمولی نشیب و فراز جن کی اس نے خوب خوب ہجو کی ہے غزنی سے دریائے جہلم تک اسے ملے ہوں گے مگر اس کوہستانی علاقے سے آگے بڑھکر بعض بیابان ایسے آئے کہ " از نہیب آں ستارہ بر آسماں راہ گم کردے و دلیل از فضائے آں بہ ہزار حیلہ جاں بکراں بردے ......

رہے گر فتم، در بیش، من کہ بُود درو۔ بجائے سبزی، سنگ و بجائے آب سراب۔
زمین چو کام نہنگ و گیا چو پنجۂ شیر۔ سپہر چوں دُم طاوس و شب چو پر غراب"

معلوم ہوتا ہے کہ یہ برسات کا زمانہ تھا جس میں مصنّف نے مغربی پنجاب کا سفر کیا اور پہلی مرتبہ ہندوستان کی گرمی کا مزا چکھا۔ ہوا کی حدت اور آفتاب کی تمازت نے اس کے حواس بگاڑ دیئے تھے کہ اوپر سے موسلا دھار بارش شروع ہوئی۔ راستے میں کئی بڑے بڑے دریا ملے جن سے مصنّف خوف زدہ ہوا لیکن ساتھ والے ان سب چیزوں کے عادی تھے وہ ان کے ساتھ ساتھ جس طرح ہوا انھیں عبور کر گیا۔ جنگل میں بڑے بڑے شیر اور غار و صحرا میں دو چار ایسے زبردست سانپ دیکھنے میں آئے جن کی پھنکار سے روز روشن شب تار بن جاتا تھا اور ہوا کے مزاج میں وبائی سمیت پیدا ہو جاتی تھی۔ انکی عجیب عجیب شکلیں اور نقش و نگار ایسے چمکتے تھے کہ گویا صحن صحرا میں کچی چاندی کے ورق بکھرے ہوئے

ہیں۔ اسی سفر میں پہلی مرتبہ مصنّف نے ہندوستاں کے تیز پا، رہزن پیشہ سیاہ فام باشندے دیکھے۔
دہلی پہنچکر مصنّف سفر کی صعوبت سے علیل ہو گیا تھا جب طبیعت درست ہوئی تو صدر عالی شرف الملک سے ملا اور اس نے مصنّف کے حال پر بہت نوازش کی۔ ایک شرف الملک کا ذکر ہم طبقات ناصری میں بھی پڑھتے ہیں جو سلطان ناصر الدین کے دربار کا معزز رکن اور امیر حاجب کے عہدے پر سرفراز تھا۔ لیکن "صدر عالی" سے مراد ظاہرا عدالت کا وہ اعلیٰ عہدہ دار ہے جسے بعد میں "صدر جہاں" اور "صدر الصدور" وغیرہ کے ناموں سے یاد کرنے لگے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف کے دہلی پہنچنے تک چند ہی روز میں یہاں مسلمانوں کی باقاعدہ آبادی بس گئی تھی اور تنظیم و تمدن کے لوازم مہیّا کر لئے گئے تھے۔ شرف الملک کی تعریف کے ساتھ بعض دوسرے لوگوں کی مصنّف نے مذمّت اور شکایت کی ہے کہ وہ ظاہرا مہر و محبت سے ملے لیکن انھوں نے اس سے منافقانہ برتاو کیا۔ اسے پڑھکر حیرت ہوتی ہے کہ ایک خالص علمی مذاق کے مرنجان مرنج نووارد کیساتھ ایسے حسد و نفاق کی کیا وجہ ہو سکتی تھی۔
یہ تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا مصنّف جنگی یا انتظامی خدمت انجام دینے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا اور نہ علوم دین میں اسے کوئی خاصی فضیلت حاصل تھی کہ کہیں عدالت کا قاضی یا کسی مدرسے کا معلّم بنا دیا جاتا۔ لیکن جب اس کے بہی خواہوں نے فرمائش کی کہ "اگر کتابے پارسی کہ طبائع اہل روزگار بسبب قصور ہمّت یا قلّت معرفت بداں مائل تر تواند بود، تالیف کردہ شود و بیتے چند در شیوۂ مدحِ ابنائے زمان نظم کردہ آید، لائقِ وقت و موافق حال افتد۔۔" تو مصنّف کو بہت رنج و تاسف ہوا۔ فارسی زبان میں کتاب لکھنے کو اس زمانے کے تعلیم یافتہ مسلمان اسی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے جس نظر سے سو برس پہلے ہندوستان میں اردو تصنیفات دیکھی جاتی تھیں۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارا مصنّف عربی زبان کی نظم و نثر لکھنے پر

بخوبی قادر تھا، پس جب فارسی کتاب اور وہ بھی محض اہل جاہ کی مدح میں لکھنے کی فرمائش کی گئی تو اسے خواہ مخواہ علم کا ماتم کرنا پڑا کہ :

"گہر سفتنم پیشہ بود و نبود خریدار گوہر، چرا سفتمی
سخن گفتنم شیوہ بود، و نبود سزاوار مدحت، کرا گفتمی
قالوا اترکت شعر قلت ضرورۃً باب البواعث والدواعی مغلق
لم یبق فی الدنیا کریم یرتجی منہ النوال، ولا ملیح یعشق

عجب از اہل روزگار و ابنائے زمانہ و اکابر کہ نتیجۂ تحصیل و ثمرہ استفادت کلمۂ چند منظوم و تالیف کتابے پارسی شناسند ؎

ہنر نہفتہ چو عنقا بماند زانکہ نماند کسے کہ باز شناسد ہمائے را از خاد

مگر جس طرح سو برس پہلے انوری کو حصول جاہ کے لئے مدرسۂ منصوریہ کے علوم عالیہ کو چھوڑ کر قصیدہ گوئی پر کمر باندھنی پڑی تھی، ہمارے مصنّف کو بھی چارہ کار یہی نظر آیا کہ تعصّب علم کو بالائے طاق رکھ کر عمر عزیز کو شعر شاعری کی خرافات اور "امور خالی" اور مقدمات وہمی میں صرف کیا جائے۔

اس طول طویل تمہید کے بعد، مصنف (ہمارے نسخے کے ،، ویں صفحے سے) اصل مضمون کی طرف رجوع کرتا ہے اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، ترائن کی دوسری جنگ، اور فتح اجمیر و دہلی سے اس کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ کتاب میں بڑے بڑے تاریخی واقعات تو سب وہی ہیں جو طبقات ناصری یا بعد کی دوسری تاریخوں میں عام طور پر ملتے ہیں اور اگر بعض جزئیات ایسی بھی ہیں جو دوسری کتابوں میں درج نہیں تو وہ کوئی خاص اہمیّت یا دلچسپی نہیں رکھتیں کہ اس مختصر تبصرہ میں ان پر بحث کرنا موزوں ہو۔ خاص اُس عہد اسلامی کی تحقیق کرنے والا مورّخ غور و کاوش سے انھیں کسی حد تک کارآمد بنا سکتا ہے۔ ورنہ نہایت ضروری امور کے متعلق

ہمارے مصنف کی کتاب ساکت ہے۔ وہ مسلمانوں کے ملکی نظم ونسق، فوجی تنظیم وتعداد جنگی ساز وسامان واسلحہ یا تمدن ومعاشرت اور بلاد وآثار کی بابت کوئی مفید معلومات بہم نہیں پہنچاتا۔ مشاہیر عہد کے حالات اور اوصاف ذاتی پر اس کی کتاب سے کوئی روشنی نہیں پڑتی حتیٰ کے واقعات کے سنین وتاریخ کو بھی وہ بہت کم درج کرتا ہے۔ اور اسی طرح اہل ہند کے عقائد وافکار، عادات واطوار کے متعلق اس نے کوئی کام کی بات نہیں لکھی۔ اس کی سعی وتوجہ تو تمام تر عبارت آرائی اور لفظی صنائع بدائع پر مبذول ہے اور وہ صفحے کے صفحے محض خیالی تشبیہات واستعارات یا شاعرانہ رنگ آمیزی کی نذر کر دیتا ہے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال قطب الدین کے ۵۹۲ھ میں غزنی جانے کا حال ہے جسے ہمارے مصنف نے تقریباً پچاس صفحے پر پھیلایا ہے ساری تحریر کا مضمون صرف اتنا ہے کہ قطب الدین بادشاہ کی طلبی پر غزنی گیا اور ضیاء الملک وزیر کے مکان میں ٹھیرایا گیا۔ بادشاہ کی خدمت میں تحائف پیش کئے۔ کچھ عرصہ تک علیل رہا اور بادشاہ نے دوبارہ اسے اپنی ولایت کو جانے کی اجازت دی۔ بعض قرائن سے گمان ہوتا ہے کہ یہ غزنی بلایا جانا، از راہ عتاب تھا اور عجب نہیں کہ قطب الدین کی علالت بھی کسی حد تک مصلحت پر مبنی ہو۔ لیکن ہمارے مصنف نے اس بادشاہی طلبی اور دوبارہ خوشنودی کی توجیہ توضیح پر کوئی توجہ نہیں کی بلکہ اس طویل فصل کو حسب ذیل ۱۷ ذیلی عنوانات سے پورا کیا ہے:-

(۱) صفت اسب ورفتار اسپ۔ (۲) صفت خریف (۳) فصل شتا (۴) صفت آتش (۵) صفت بیماری۔ (۶) صفت طبیب (۷) بشارت صحت (۸) صفت باغ (۹) صفت جشن (۱۰) صفت ساقیان (۱۱) صفت حباب بر سر پیالہ (۱۲) صفت ارباب طرب (۱۳) صفت چنگ (۱۴) صفت بربط۔ (۱۵) صفت کمانچہ (۱۶) صفت نائے اور (۱۷) صفت دف۔

الغرض ہمارا مصنف اتنا عمدہ مورخ نہیں جتنا اعلیٰ درجے کا انشاپرداز ہے اور میرے نزدیک تاج المآثر کی یہی دوسری خصوصیت اس قابل ہے کہ اسے فارسی علم ادب میں ایک ممتاز مرتبہ دیا جائے۔ اس پہلو پر زیادہ زور دینے کی ضرورت اس لئے ہے کہ ایران میں تو تاج المآثر کو کوئی جانتا نہیں اور ہندوستان میں اس کی کمیابی اور فارسی نثر سے عام بے توجہی کے باعث کوئی اسے نہیں پڑھتا اور افسوس ہے کہ یورپ کی سب سے جدید اور جامع "تاریخ ادبیات ایران" میں تاج المآثر کا کہیں ذکر بھی نہیں آیا ہے۔ حالانکہ انصاف یہ ہے کہ سعدی سے قبل نثر فارسی کے پہلے دور میں اس کتاب سے بہتر انشاپردازی کا نمونہ کہیں نظر نہیں آتا۔ پانچویں صدی ہجری کی ابتدائی نثر کی سب سے مشہور یادگار ناصر خسرو کا "سفر نامہ" نظام الملک طوسی کا "سیاست نامہ" اور شہزادہ کیکاوس کا "قابوس نامہ" سمجھی جاتی ہیں بیہقی کی تاریخ اور زین الاخبار، نیز تصوف پر شیخ علی ہجویریؒ کی تصنیف "کشف المحجوب" اسی صدی میں لکھی گئیں۔ لیکن جیسا کہ ہر فارسی کا طالب علم جانتا ہے ان کتابوں میں انشاپردازی کی کوئی خاص خوبی نہیں ہے اگرچہ سفرنامہ ناصر خسرو اور قابوس نامے کی فلسفیانہ سادگی میں ایک دلچسپی اور ہلکی رنگینی پیدا ہو گئی ہے۔ چھٹی صدی کے مشہور مصنفوں کی عبارت میں ہم زیادہ پختگی اور سنجیدگی پاتے ہیں جس کا قابل قدر نمونہ نظامی عروضی سمرقندی کی تصنیف "چہار مقالہ" ہے اور اگر یہی رنگ قائم رہتا یا اس کو ترقی دی جاتی تو آج فارسی ادب کے متعلق اہل ذوق کو یہ شکایت پیدا نہ ہوتی کہ اس میں ایسی نثر کی مثالیں بہت کم ہیں جو خطابت و شاعری کے عناصر سے بالکل پاک ہوں۔ اس کے برخلاف اس زمانے کی عربی انشاپردازی کی دیکھا دیکھی فارسی مصنف بھی شاعرانہ عبارت آرائی اور مرصع نگاری کی طرف مائل ہو گئے اور ساتویں صدی میں سعدی نے نثر کا جو معیار قائم کردیا وہ بجائے خود کیسا ہی دلکش و دل پذیر ہو، شاعرانہ ترجیع و تکلف

متعجن بطنی الصوا رمبرق تحت الغبار وبالصوا ھل من عل

و در سلک خدمت، دلیران نامدار بسان ثریا مجتمع و منتظم گشتند و گردان نامجوئے مانند کواکب صف کشیدند۔ ہمہ در جنگ چوں قطب گردون تیز گرد، استوار۔ و بر زمین ناورد چوں خط محور بر فلک سرگرداں پائے دار و بسان صاعقہ و شہاب، باتیر و تژو بیں۔ و چوں سپہر و ماہ، جوشن در و سپر دار۔ و بکردار تیر و ناہید دو رہین و خنداں رو۔ و بشکل آفتاب و بہرام تیغ زن و خنجر گزار۔ و بر مثال مشتری و کیواں روشن رائے و کینہ افزائے نظم:۔

بگرز آہن ساو بہ نیزہ صخرہ شکن | بہ تیر موئے شگاف و بہ تیغ شیر اوژن
قوم ترٰی ارماحھم مشغوفۃ | یوم الوغا بموطن الکتمان
تیسر بلون اسنۃ وصفائحا | والموت بین صفیحۃ وسنان

و با چنیں لشکرے جرار و حشمے نامدار روئے بجنگ رائے بنارس آوردند و چوں بین العسکرین تقارب پذیرفت و محاربہ در مواجہ خواست افتاد رائے ممالک آرائے خدایگانے کہ نمودار عقل کل و آئینہ عالم غیب و مطلع آفتاب نصرت و جام گیتی نمائے ظفر است چناں اقتضا فرمود کہ خسرو جہاں کشائے عدو بند۔ بایک ہزار سوار از حماۃ بیضۂ اسلام و حفظۂ ثغور دیں ... رواں شود و از لشکر مخالف: نظم

اگر دو آید پیشش کند بہ نیزہ یکے | وگر یک آید پیشش کند بہ تیغ دو نیم

. . . .

و چون در مقدمہ سانح خیر و طائر میمون روئے نمود و دلائل نجح امارت ظفر پیدا گشت و بحصول نیل مراد اصلی دریافت مقصود کلی تیقن و وثوق افزود و عزیمت خدایگانے کہ ہمیشہ بتائید آسمانی موید است و فتح مبین و نصر عزیز از نتائج مقدمات، رائے درویت مبارک مصمم شد کہ

فوجے از حشم منصور در خدمت رکاب اعلیٰ ملازم باشندہ

درخدمتِ رکاب تو سر بر زمیں نہاد　　خورشیدِ زآسمانِ چہارم ہزار باد

ودیگر امرا و سرخیلاں واصناف متجندہ روئے بقمع وقہر رائے بنارس آرند وآداب لشکر کشی ومراسمِ سپاہ آرائی بتقدیم رسانند و بر فور جمعے از سوار... روئے بموقف جنگ وجدال آوردندہ

فوارس طعانون مازال للقنا　　مع الشیب یوماً فی مفارقہم خطو

سوارشاں بہ شجاعت چو حیدر کرار۔ پیادہ شاں بجلادت چو رستم دستاں بہ وچوں رائے بنارس جیت چند را کہ عمدۂ کفر وضلال ومادہ عجب واحتیال بود۔ حرکت راياتِ ہمایوں ونہضت مرکضت لشکر منصور روشن گشت دنقاب شک وحجاب شبہت از پیش نہاد خیال وتصورات او برخاست بالشکرے گراں وسپاہے بیکراں کہ شمار آں از عدد رمل ونمل زیادت بود وتتابع وفود وافواج نامحدود ایشاں چوں ادوار فلکی بے نہایت نظم

شہاب سطوت ودریا شکوہ (و) بادہیب　　زمانہ بسطت وگردوں تواں وکوہ یسار

بہ پیل غرہ وازکس نیافتہ مالش　　زمال مست وزتنبیہ ناشدہ بیدار

بمقاومت وقتال پیش آمد... وجوہ حشم ورؤس لشکر ہند جنگ را ساختہ وآمادہ گشتند درایات منکوس شرک واعلام معکوس کفر برافراختند، وپیل بر صحرائے معرکہ چوں دریائے دماں از باد بجوش آمدہ در زیر برگستواں مانند حصار آہنیں پوشیدن گرفت نظم

حصارے کہ ہم زو بود منجنیقش　　ببالا ومن گرندید ست بنگر

تو گوئے کہ طور ست موسیٰ مہابت　　بجائے عصا آں کشے مار پیکر

وادکن اللون ذی ناب لہ شخص　　ترلہ ھیکلاً کالطود مرتفعا

دبنگ خونریز بخوں دل بہرام خضاب می کرد وبہ آسیب زخم روے روئے پشتِ ماہی

خستہ می گردانید وخرطوم ثعبان(اژدہا) شکل او قلادہ شیر فلک می شد و منطقہ جوزا و حلقۂ ثریا می گشت گفتی از ہیکل آں ابر صورت جہاں بہ نیل آگندہ اند واز بالائے آں کوہ پیکر سد سکندر بر آورد نظم

چناں کوہ کز وے شود کوہ پست | چو زنگ نہد بر سر کوہ دست
چہ دیو از سیاہی و چوں او بلند | چو آتش بخشم و چہ او با گزند
ز جنبش فلک باز ماند چہ باز | بخرطوم یا زد بسوئے فراز

. . . .

و از شیہ اسپ و نالہ پیل ماہ بر آسماں راہ گم کرد و غریو کوس حربی نصر من اللہ بگوش موحداں رسانید و آواز سپیدہ مہرہ و دم نائے روئیں بعیوق بر آمد۔ ۵

جان دشمن چوں کبوتر پرد از تنخص چو نے | در وغا چوں نائے روئین تو آید در صفیر

و مخوائے ان زلزلۃ الساعۃ شئی عظیم حجاب شبہت از پیش جہانیاں برداشت و حقیقت تکاد السموات تنفطرن منہ و تنشق الارض بر دلہا کشادہ گشت:

والشمس فی کبد السما مریضۃ | والارض راجفۃ تکاد تمود
فلک راتف تیغ در تاب کردہ | جہاں را دم نائے بر سر گرفتہ

و از عکس رایات رنگا رنگ کہ با نسریں دیدار می کرد ہوائے نا ورد کہ مانند پر تدرو و طاؤس گشت و از فروغ بیرق گوناگوں با سماکیں راز می گفت، زمین معرکہ بسان گلزار و لالہ ستاں شد ۵

بساں قبہ کسرا زمین از زینت لشکر | بہ شکل نامہ مانی ہوا از رایت ایواں
لہ رایت حمر ابا النصر تخفق | لہا لہجۃ فی فلکئی الریح تنطق
من الذہب الابریز صیغ بر اسہا | نصید طیور النصر باز محلق

و هر دو لشکر چوں دو کوه پولاد صف کشیدند و بساں دو دریائے دمان از باد صرصر در تموج در آمدند و عرصهٔ هند از سوار و پیاده چوں دشت محشر تضائق پذیرفت

. . . .

و زجل تهلیل موحدان از اوج کیواں بگذشت و آواز تکبیر مجاهداں دل از شیر ژیاں بستد
۵ نعره اللہ اکبر موکبت گفته بلند ـ آیت نصرٌ من اللہ رائتت کرده بیان
و فضائے معرکه از جوشن و روزره دار آهنیں شد و هوائے رزمگاه از برقِ تیغ و صاعقهٔ خنجر آتشیں گشت ـ گفتی از ابرِ کیں بجائے مطر تبر و نیزه می بارد و از زمین جنگ بجائے نبات شل و بهله می روید . . . .

. . . .

و گوش تگاوراں نبوک سناں آرائش یافت و عنان مبارزاں از چپ و راست گرداں شده و از پیچش و گردش سواران غیبهائے جوشن چاک گشت و از مقاومت و مصادمت شیرانِ کارزاری پیل بر پیل جنگی افتاد و از نائره جنگ و پیکار سلاح بر تن مردانِ کار بتفسید ـ

. . . .

و ناوکِ دیده دوز حلقه زره و غیبه جوشن می درید و پیلک سینه دوز ترک بر تارک جوشن وران می دوخت و صاعقه کردار به آتش زخم جگر مردان کار و دلیران نامدار می سوخت و در چشم مبارزاں افزوں از خار مژگاں جائے می گرفت و مرغ روح را از قفس قالب در فضائے عالمِ ارواح پرواز می داد . . . .

رائے بنارس که به لشکر انبوه و ژنده پیلاں بسیار مغرور گشته بود و نخوتِ "الیس لی ملک مصر"

بدماغ راہ دادہ واز دقیقہ الم ترکیف فعل ربک باصحاب الفیل غافل ماندہ، ناگاہ از کشادِ بندگانِ دولت کہ بر سپہر دوتا دیدہ سہی بدوزند و بر گنبد اخضر ہفت اختر ثریا کنند و بحکم آرش آسا در شب تار بہ تیر موئے شگافند و نوک پیکانِ تیر در تیزی خار نشانند، خدنگ مرغ صورت بحقہ حدقہ او رسید و در ہودج آسمان سیمایک بہلک فنا بر مقتل خوردو از قد فرقد سائے پیل نگوں بر خاک افتاد.... .... و کوکب رفعت او از چرخ جلال و اوج کمال در گذشت و شاخ حیاتش از دوحہ ممالک بریدہ شد و ندائے اینما تکونوا یدرککم الموت بسمع جاں او رسید و کذالک اخذ ربک اذا اخذ القری وھی ظالمۃ۔ ان اخذہ الیم شدید سر او کہ کبوتر خانہ ہوا و ہوس گشتہ بود و نشیمن شاہین سودائے فاسد و جرہ باز امانی و آمال کاذب شدہ و مرغ غرور و غفلت در وے بیضہ نہادہ و در ہوائے ملک پر و بال فتنہ و عصیاں برآوردہ۔ افسر دار کردہ آمد و تن آن بادسار کہ بشمشیر آبدار آتش حرب می افروخت پیش بارگاہ (لازال ملثم شفاہ الجبابرہ)؟ بر خاک مذلت و ہواں انداختہ شد؛

۲۔ فتح قلعہ تھنکر بیانہ

و چوں در ظلّ ظلیل اقبال بحدود تھنکر رسیدہ آمد و مرکز شرک و ضلال مخیم غز و جلال شد و اطناب سراپردہ شہنشاہی سر بعیوق افراخت ....

....

و بندگان شاہ ہمہ بر مرکبان شاہین شوکت عنقا صولت سوار گشتہ گرد حصار بصفت کوہ آہن در آمدند و پیرامن قلعہ چنانکہ باد از میان ایشان دشوار گذشتے صف کشیدند....

وازجوانب واطراف آں حصنِ منیع کہ اساس آں دراستواری باسدّ سکندری دعویٰ برابری بل تصلّف زیادتی می کرد وازبلندی برجهائے آں از بروج آسماں واوج کیواں می گذشت وپایان خندق آں پشت سمک رسیده ازقعر بحر محیط خبرمی آورد وسرکنگرش برروئے سماک برآمده ازذروۂ فلک اعظم نشان می داد بسان صرصر حمله ها تند می کردند . . . . .

. . . .

دتیرجگردوز درزی صفت مغفر برسرجنگیاں می دوخت وچوں سوزن ازحریر وپرنیاں ازخود وخفتان می گذشت ومانند برق وصاعقه ازغیبۂ جوشن روشن گزاره می شد وروئے سپهرچوں پشت پروین پُرازچشمه وروزن می کرد۔ ودرپلک چشم اعدا افزوں ازمژه خارپیکان می نشست . . . .

ودریک ساعت چهاردیوارآں حصن محکم وسدّ معظم که نشیب وفرازشب به ثری وثریا رسیده بود وپایان خندقش وسرکنگره بماهی وماه پیوسته وفتحنامه آں نه دیده بان دیده وطلایه خیال بخواب وبیداری دیده ونه وزیرهوش وبرید گوش هیچ وقت ازترجمان زبان شنیده ازبسیاری نقب وحفرچون چشمه زره وخانه زنبورشد وازنون نعل تگاوران ثلمها ورخنه ها بسان دندان هائے سین بدوراه یافت ؎

آنکه زتاثیرعین نعل سمندش قلعه بدخواه ملک رخنه چوسین است

وبه امداد تائید ونصرت آسمانی ومیامن همّت واقبال روزافزوں خدائگانے چنیں قلعه حصیں که طریق استخلاص آں برملوک دنیا وخسروان گیتی بسته بود کشاده گشت

۳- صفت مسجد آدینہ دہلی (۲۴۶)

و یکے از طراز کسوت مآثر و عنوان نامہ مفاخر مسجد جامع دہلی است کہ از صفائے عقیدت وکمال حسن ایمان کہ انما یعمر مساجد من آمن باللہ والیوم الآخر، بنائے آں کہ چوں بنیاد کعبہ ہمیشہ معمور باد و بلسان ام القریٰ در جہاں مذکور آغاز افتاد، و قول نبوی علیہ الصلوٰۃ والتحیات کہ تلو وحی الٰہی است: من بنی اللہ مسجداً ولو کمفحص قطاۃ بنی اللہ لہ بیتاً فی الجنۃ دستور و مقتدی ساخت و تاکید بنیان آں و تشئید ارکان آں از پسندیدہ ترین آثار و مساعی شناخت و گرد از بوم بتخانہا کہ بسان صورت نامہ مانی ولعبت خانہ آذر آرائش یافتہ بود بہام ایں فلک آبگوں رسانید و بسم بادپایان آتشگیر و غرندہ پیلان کوہ پیکر فجعلنا عالیہا سافلہا صورت حال آں گردانید و بتان سنگین را کہ معبود اہل شرک و مسجود ارباب ضلالت اند با دیگر اسباب وادوات عمارت بخطہ دہلی فرستاد و قاعدہ آں چوں نہاد کوہ واساس دولت از مال بے شبہت رسوخ پذیرفت و دیوارش کہ ھی اعلیٰ من مناط الثریا دست ارتفاع در کمر جوزا زد و بساں سد سکندر، بنائے ہرمان بسنگ خارہ استحکام یافت و منبر و محراب بلطائف کتابت و دقائق صنعت آراستہ شد و باشکال غریب و نقوش بدیع ساختہ و پرداختہ گشت۔

ہمی بینند ز اشکالش جمال قصر نوشرواں | ہمی گیرند ز ارکانش مثال سد سکندر
کشیدستند در سقفش تو گوئے جامۂ دیبا | فگندستند در صحنش تو گوئے تختۂ مرمر

و قبہائے زریں بتمامہا مانند چتر آئینہ کردار خورشید و تاج گوہر نگار ناہید بر شرف آں نہادہ آمد و بیامن رائے مبارک چنیں بقعہ متبرک نزہت جائے اہل صفا و مہبط اجابت دعا شد۔ گفتی رضواں روضۂ از بہشت بدنیا فرستادہ است و ملک آنرا چوں کعبہ، قبلہ و مزار خویش ساختہ

ہوائے انس افزائے آں صافی تراز چشمہائے نور و صحن غم زدائش آراستہ تراز چہرہ حور ؎

ز روشنائی صحن و ہوائے وے در وے
ہمی نماند ز اسرار غیب پوشیدہ

از فضائے روح پرور او روح فردوس اعلیٰ معائنہ می کرد و از آں عرصۂ نزہ (؟) درِ وجنۃ عرضہا السموات والارض بر دلہا کشادہ میشود و امارت و فیہا ماتشتہی الانفس و تلذ الاعین مشاہدہ می افتد۔ اشعار

تبارک ذو العرش ماذا تری
من الحسن فی جانب المسجد

ازیں سپس من و صحرا و صحن اُو کہ دلم
ز تنگنائے بسیط جہاں بہ جاں آمد

ز سینہ دل بہ تماشا بر آمدم بدہاں
چو ذکر نزہت آں بقعہ در دہاں آمد

۴۔ مدح وزیر موید الملک محمد جنیدی (۵۸۲)

و صدر مسند وزارت بمکان صاحب اجل کبیر موئد الملک محمد جنیدی کہ از کمال مرتبت او آصف برخیا اگر در حیات بودے از آتش غیرت آب حیا ریختے۔ و صاحب عباد اگر زندہ گشتے پیش آفتاب قدرش چوں باد و سایہ رُخ برخاک نہادے ؎

مہ است آں صاحب سے درچہ در فضل
وزو (؟) کم حاتم طے درچہ در جود

ن ن ن ن ن ن ن ن ن

و برائے صائب کہ در شب تار نوائب چراغی نور افزائے و شمعی ظلمت زدائے است از سر پیراں اشراق و اماثل چوں آتش و باد از مرکب آب و خاک بر سر آمد

راش از با فلک خطاب کند خاک در چشم آفتاب کند
چرخ بدمست را بجام غرور رائے ہشیار او خراب کند

. . . .

وبجمال فضل وجمال افضال کہ بوسیلت ایں فضائل وفضیلت ایں وسائل خامہ ملک وبیں یمین کاں (؟) یسار گرفتہ است وخاتم عزو تمکیں در انگشت سحاب آثار کردہ بسان چہار ارکان انگشت نمائے جہانیاں گشت نظم

آسماں چوں نگینہ پیروزہ است دہر زاں آمدت بزیر نگیں
از یسار تو دہر کردہ یسار بہ یمین تو دہر خوردہ یمیں
نوک کلک تو رازدار فلک نور ظن تو رہ نمائے یقین
لاتا منوا آراءہ وظنونہ ان العیون لھا من الامداد
وتعوذوا باللہ من اقلامہ ان السیوف لھا من الحسّاد

وبحسن تدبیر کہ پاے داری دولت بے پائے مردی او ممکن نگردد آب بر روئے ممالک ہند باز آورد وبہ یمینِ قلم کہ دستگاری تیغ بے دستیاری او صورت نہ بندد آتش شر وگرد فتنہ بنشاند ؎

داد کلک بیقرارش کار عالم را قرار داد رائے تابشش مر ملک دنیا را ثبات

. . . .

وبنور عقل کہ آئینہ صفت صورتِ حقائق نماید آتش عنف را بآب لطف و مرحمت تسکین داد وبجمال بردباری کہ پیرایہ خرد و زیور ہنر است باد نخوت را پاے بست خاک تواضع گردانید . . . . . . وذات او کہ بر امتداد ذوات عناصر باقی باد بمشارکت

این دو صنعت که ما جمع شیٔ الی شیٔ، افضل من علم الی حلم آرائش یافت و به استجماع این خصائص که تا باد فرد زندۂ آتش و آب همنشین خاک است مثل آن ندیده، از بزرگانِ روزگار مستثنیٰ شد ...... ؎

از حلم اوست یافته جرم زمین درنگ ... وز عزم اوست یافته دور فلک عجل

و بسیط خاک بواسطۂ تیغ آب رنگ آتش تاثیر شاه سلیمان سریر نزهت گلشن افلاک پذیرفت و عرصۂ ملک از آثار قلم باد مسیر دستور آصف تدبیر اشراق عهد قدیم باز یافت ؎

شنیدی حدیث سلیمان و آصف ... بیا تا سلیمان و آصف به بینی

....

در دولت از کفایت کلک نظام دین ... بینیم اثر چنانکه بملکت نشان تیغ

گر پاسبان ملکِ جهاں تیغ تیز تست ... از فر تست خامه اُو پاسبان تیغ

موفور شد ز دانش او کار و بار ملک ... معمور شد ز کوشش او خان و مان تیغ

جاویدان خرد

(از خامہ نواب صدر یار جنگ بہادر مدظلہ العالی)

میرے کتاب خانہ میں ایک قلمی نسخہ کتاب جاویدانِ خرد کا ہے اس کتاب کے ۱۸۲ ورق ہیں۔ خط نسخ میں خوشخط لکھی ہوئی ہے۔ مطالعہ سے صحیح مقابلہ شدہ بھی معلوم ہوئی آخر سے ناقص ہے اس لئے سنہ کتابت معلوم نہیں ہوسکتا خط اور کاغذ کی ہیئت کذائی ظاہر کرتی ہے کہ کم از کم دو سو برس پہلے کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔ ممکن ہے اس سے بھی زیادہ کا ہو۔ لکھنؤ سے یہ نسخہ ملا۔ معلوم ہوا کہ قصبات اودھ میں سے ایک قصبے کے کتاب خانہ کا ہے۔ میں نے کتاب خانہ آصفیہ حیدرآباد و کتاب خانہ ریاست رامپور سے خط کتابت کی تو معلوم ہوا کہ دونوں جگہ یہ کتاب نہیں ہے۔

یہ نسخہ دراصل استاد ابو علی* احمد بن محمد بن یعقوب مسکویہ کی کتاب "آداب الفرس و العرب"

---

* ابن مسکویہ متوفی ۴۲۱ھ اخلاق کے امام ہیں۔ کتاب الطہارۃ اون کی فن اخلاق میں مشہور ہے محقق طوسی نے اخلاق ناصری میں اسکی بہت تعریف کی ہے۔ تجارب الامم وغیرہ اور تصانیف بھی اون کی ہیں۔ انجمن ترقی اُردو نے اون کی کتاب الفوز الاصغر کا بنام القول الاظہر اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔

ہے جو عربی زبان میں ہے۔ مگر مشہور جاویدان خرد ہے۔

ابو علی مسکویہ نے دیباچہ میں لکھا ہے۔ میں نے نو عمری میں ابو عثمان الجاحظ* کی ایک کتاب جس کا نام "استطالۃ الفہم" ہے پڑھی تھی۔ اُس میں ایک کتاب، جاویدان خرد کا ذکر میں نے پڑھا۔ مولف اس کے چند اقوال نقل کر کے بہت زیادہ عظمت سے اُس کا ذکر کرتا ہے جو اس کی عام عادت کے خلاف ہے۔ اس کو پڑھ کر مجھ کو اصل کتاب کی تلاش ہوئی۔ دورانِ سیاحت میں فارسی کے ایک موبد موبدان کے پاس وہ مجھ کو ملی۔ میں نے اس کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ اس کے مضامین فرس، ہند، روم و عرب کے حکمیہ مضامین سے بہت کچھ مشابہ ہیں۔ اگرچہ مقدم وہی کتاب ہے اس لئے کہ وہ وصیت ہے اوشہنج کی اپنے اخلاف و ملوک مابعد کے لئے۔ یہ بادشاہ طوفان نوح کے بعد ہی تھا۔ اس سے پہلے کی کوئی سیرت یا ادب جو مفید ہو موجود نہیں ہے۔ اس لئے میں نے ارادہ کیا کہ میں وصیۃ مذکورہ کو بجنسہ لکھوں پھر اس کے ساتھ امم اربعہ کے وہ وصایا (نصائح) ملا دوں جو میں نے منتخب کئے تھے یعنی فرس۔ ہند۔ روم و عرب۔

اس کے بعد اوشہنج (غالباً ہوشنگ) کے وصایا نقل کئے ہیں جو گیارہ صفحے پر ہیں۔ جاویدان خرد کے خاتمے پر اس کے دستیاب ہونے کا واقعہ لکھا ہے جو عجیب ہے۔

---

* امام جاحظ فن ادب وغیرہ کا مشہور امام اور معرکۃ الآرا تصانیف کا مصنف ہے۔ وفات ۲۵۵ھ۔ (معاصر مامون ہو سکتا ہے)۔ استطالۃ الفہم کتاب خانہ آصفیہ میں نہیں۔ کتاب خانہ ملّی پیرس۔ برٹش میوزیم اور برلن کی جو فہرستیں کتاب خانہ مذکورہ میں ہیں اُن میں بھی اس کا ذکر نہیں۔ ان معلومات کے لئے میں مولوی سید عباس حسین صاحب مہتمم کتاب خانہ آصفیہ کا ممنون ہوں۔ شروانی۔

اور وہ حسبِ ذیل ہے۔

ابو عثمان جاحظ کا بیان ہے کہ حسن بن سہل ذو الریاستین کے بھائی نے لکھا ہے (یعنے جاویدان خرد کے خاتمے میں) کتاب جاویدان خرد میں سے جو اوراق ہم نے حاصل کئے تھے اُن کا یہ ترجمہ ہے۔ اگرچہ اُن میں سے بہت سا حصہ اس وجہ سے ہم نے چھوڑ دیا ہے کہ اس کے بعض حصوں کو بعض حصوں سے ربط نہ تھا۔ اس کی علت یہ ہے کہ ذوبان اسقدر کشادہ دلی بحر سکا کہ کتاب مذکور کے جملہ اوراق مرتب و منتظم ہم کو دیدیتا۔ اس حصہ کو ہم نے بالکل ساقط کر دیا اس لئے کہ ہم کو اس میں کوئی فائدہ نہ معلوم ہوا۔ بعہذا جو شخص تھوڑے سے نفع نہ اٹھائے وہ بہت سے بھی نہیں حاصل کر سکتا۔ جسقدر ہم نے لکھدیا ہے طالب نفع کے لئے وہ کافی ہے۔ والحمدُ للہ حق حمدہ وصلی اللہ علیٰ خیر خلقہ محمّد عبدہ وعلیٰ الائمۃ الطاہرۃ من بعدہ وحسبنا اللہ وحدہ۔ بقول ابن مسکویہ ابو عثمان جاحظ نے اس کتاب کا حال اپنی کتاب استطالۃ الفہم میں یوں بیان کیا ہے کہ مجھ سے واقدی نے کہا کہ مجھ سے فضل بن سہل (ذو الریاستین) نے بیان کیا کہ جب خراسان میں مامون کی خلافت مشتہر ہوئی تو بادشاہوں کے تحائف ہمارے پاس آئے۔

کابلستان کے بادشاہ نے ایک پیر مرد کو بھیجا جس کا نام ذوبان تھا۔ اور لکھا کہ میں ایک ایسا تحفہ بھیجتا ہوں کہ روئے زمین پر اُس سے بلند تر روشن تر معزز تر اور زیادہ قابل فخر تحفہ نہیں ہے۔ مامون کو تعجب ہوا اور کہا کہ پیر مرد سے پوچھو کہ اس کے پاس کیا ہدایا ہیں۔ چنانچہ میں نے اس سے پوچھا۔ اس نے کہا کہ میرے پاس میرے علم سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ میں نے کہا وہ کیا ہے۔ کہا کہ تدبیر و رائے اور رہنمائی یہ سن کر مامون نے حکم دیا کہ معزز طریقہ سے اس کی مدارات کیجائے اور اس کا معاملہ پوشیدہ

رہے۔ جب عراق پر حملہ کا ارادہ اپنے بھائی محمد سے لڑنے کے لئے مصمم کر لیا تو مامون نے ذوبان کو بلا کر مشورہ کیا اور اس نے اس ارادہ سے اتفاق کیا۔ اس مہم میں مامون کو ذوبان کی صائب رائے کا تجربہ ہو گیا۔ فتح عراق پر ایک لاکھ درہم انعام دیا گیا۔ ذوبان نے انکار کیا۔ اور کہا کہ میرے بادشاہ نے مجھ کو جہاں پناہ کی خدمت میں بے ادبی کے لئے نہیں بھیجا ہے۔ بادشاہ سلامت میرے انعام قبول نہ کرنے سے ناراض نہ ہوں۔ میں نے اُس کو کم سمجھ کر واپس نہیں کیا ہے بلکہ میں آپ سے ایسے انعام کا امیدوار ہوں جو اُس سے بھی بڑھ کر ہے۔ اور وہ ایک کتاب ہے جو عراق میں موجود ہے۔ اُس میں اول فارس کے علم اخلاق اور علوم کا بیان ہے۔ اور وہ فارسی کی بڑی کتابوں میں سے ہے۔ اور وہ مدائن کے ایوان کے نیچے کے خزانوں میں ملیگی۔ جب مامون رشید کا اقتدار بغداد میں ہو گیا تو ذوبان نے اپنا مدعا یاد دلایا۔ مامون نے حکم دیا کہ کتاب کی کیفیت اور اس کا مقام لکھوا لیا جائے۔ ذوبان نے لکھا اور تعین مقام کر دیا۔ چنانچہ موقع کھودا گیا تو ایک چھوٹا مقفل صندوق نکلا۔ مامون نے وہ صندوق ذوبان کے سپرد کر دیا۔ ذوبان نے کھولا تو ایک ریشمی پارچہ میں سے اوراق کتاب نکلے جو شمار میں سَو تھے۔ صندوق میں اُنکے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ذوبان اوراق مذکور لے کر دربار خلافت سے چلا گیا۔ سہل نے امیر المومنین سے کہا کہ میں اس سے پوچھوں کہ کتاب میں کیا ہے۔ مامون نے انکار کیا۔ سہل نے بطور خود ذوبان سے کتاب کا حال دریافت کیا تو اس نے کہا۔ یہ جاویدان خرد ہے۔ جس کو گنجور وزیر شاہ ایران شہر نے حکمۃ قدیمہ سے اخذ کر کے لکھا ہے۔ سہل کا قول ہے کہ میں نے ایک ورق لیکر بہت غور کیا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تب میں نے خضر بن علی کو طلب کیا۔ یہ صبح کا ذکر ہے۔ اس نے میرے سامنے اس کو پڑھا اور سمجھایا میں لکھتا گیا۔ پھر میں نے دوسرا

ورق لیکر اسی طرح سمجھا اور لکھا - غرض تیس ورق کم و بیش اُس روز دوپہر تک لکھ لئے -
دوسرے موقع پر جب میں نے ذوبان کے پاس جاکر اوراق دیکھنے چاہے تو اُس نے انکار کیا اور کہا کہ اگر علم ایسی چیز نہ ہوتی جس میں بخل کرنا چاہیئے تو میں کل اوراق تم کو دکھا دیتا لیکن یہ ممکن نہیں ہے - جو اوراق میں نے لکھے تھے اُن کے مضامین باہم مربوط نہ تھے اس لئے کہ اُن میں ایسی باتیں بھی تھیں جو سمجھ میں نہ آسکیں -

ایک روز مامون نے حسن سے پوچھا کہ فارسی کتابوں میں کونسی کتاب بہتر ہے -
حسن نے کہا جاویدان خرد - اس پر مامون نے اپنے کتب خانہ کی فہرست طلب کی اُس میں یہ کتاب نتھی تب حسن نے پیش کی مامون نے پڑھی پسند کی اور کہا کہ باقی اوراق کہاں ہیں حسن نے کہا ذوبان نے نہیں دیئے مامون نے کہا کہ اگر معاہدہ کا ایک سرا خدائے تعالے کے ہاتھ میں اور دوسرا میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو میں اُس سے یہ کتاب لے لیتا - اسقدر بیان کے بعد استاد ابو علی کہتے ہیں کہ یہ کتاب اوشنج اور اُس کی داستان کا آخری بیان ہے -

مامون رشید کی شیفتگی اور لوگوں کے بخل کا حال تم سن چکے - اُس نے جو ابواب اضافہ کئے ہیں اُن کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ وہ خوبی میں اوشنج کی کتاب سے بڑھے ہوئے ہیں -

اس کے بعد استاد نے ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں خلاصۂ حکمت بطور کلیہ درج کیا ہے اُس کے بعد مختلف اقوام کے اخلاقیات لکھے ہیں -
اول ادب فرس ہے اس میں حسب ذیل عنوانات ہیں - مواعظ اذرباد[1] - و بزرجمہر[2] جوابات[3] کسری بن قباد (جو ملک روم کے سوالوں کے جواب ہیں) وصیت[4] بزرجمہر کی

کسریٰ کو۔ نوشیرواں[5] کے نصائح۔ شاہ بہمن[6] کے نصائح۔ ایک اور حکیم فارس کی نصیحت اہل فرس کی ایک اور وصیت۔ فصل[9] فصل[10]۔ یہ حصہ ورق نمبر ۱۲ سے شروع ہو کر ۵۲ پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح ۴۱ ورق ہیں اس کے بعد حِکَم الہند ہیں۔ ان میں کسی حکیم کا نام نہیں صرف اقوال ہیں۔ یہ ورق نمبر ۵۹ پر ختم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ۱۳ صفحے ہیں۔

اس کے بعد حکم العرب ہیں۔ اس میں اول احادیث نبوی (۵ صفحے) اقوال امیر المومنین حضرت علی۔ مختلف صحابہ کرام اور علماء و صوفیہ و سلاطین کے اقوال ہیں۔ اسی میں حضرت لقمان کے نصائح شامل ہیں۔ یہ حکم العرب ورق ۱۱۳ پر ختم ہوتے ہیں درمیان میں بعض ورق نہیں ہیں معلوم نہیں کتنے کم ہیں۔ بہر حال کتاب میں ۵۵ ورق ہیں۔

اس کے بعد حکم الروم ہیں جن سے یونانیوں کے اقوال مراد ہیں اس لئے کہ سقراط وغیرہ کے اقوال نقل کئے گئے ہیں۔ اس میں سقراط۔ ارسطو طالیس۔ ہرمس۔ افلاطون۔ دیوجانس فیثاغورس۔ قابس شاگرد افلاطون۔ وابرقلیس کا مکالمہ وغیرہ ہے۔ یہ حکم ورق نمبر ۱۵۳ پر ختم ہو جاتے ہیں۔ جملہ ۴۰ ورق۔ ورق نمبر ۱۵۴ سے حکماء متاخرین یعنے حکمائے مسلمین کے نصائح و حکم ہیں انہی پر کتاب کا خاتمہ ہے۔ لکھا ہے کہ بوجہ متقدمین و متاخرین کی حکمتوں کے جامع ہونے کے یہ نصائح سابق نصائح سے افضل تر ہیں لہذا مستقل باب و آخر میں مذکور ہوئیں۔ پہلے خود چند فصول لکھے ہیں اس کے بعد آداب ابن المقفع۔ اس حکیم کا نام داذبہ بن داذ جشنش لکھا ہے۔ اسلامی نام عبداللہ ہے۔ کلام ابو نصر الفارابی۔ اسی پر ہمارا ناقص نسخہ ختم ہو جاتا ہے۔

ہمارے مضمون کا یہ پہلا حصہ ہے جو سرسری بیان مطالب کتاب کا ہے اصل بحث دوسرا حصۂ مضمون چاہتی ہے جس میں مختلف اقوام کے اقوال کا خلاصہ و مقابلہ کیا جائے۔

و ماتوفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

کتاب جاویدان خرد کا ترجمہ فارسی میں محمد حسین بن حاجی شمس الدین نے سنہ ۱۰۶۵ھ میں اپنے مربی صوبہ دار مالوہ کی (جن کا نام درج نہیں) فرمائش سے کیا جو بہت شوق سے اس کتاب کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ ترجمہ لفظی نہیں التقاطی ہے برعایت اختصار وحذف مکررات۔ اسی لئے انتخاب نام ہے۔ یہ ترجمہ سنہ ۱۲۹۴ھ میں قیاساً بمبئی میں چھپا ہے اور کتاب خانہ آصفیہ میں ہے۔

یہ ترجمہ مانک جی پارسی نے چھپوایا ہے۔ فارسی میں دیباچہ وخاتمہ بھی لکھا ہے جس میں خالص فارسی الفاظ زیادہ استعمال کئے ہیں۔ یہ ترجمہ اُن کو ایران میں ملا تھا جہاں وہ بتقاضائے حب وطن تیئس سال سے تھے۔

امید منزل صدر یار جنگ

جُغرافیہ اِندُلس

(بقلم جناب مولوی عنایت اللہ صاحب ناظم دارالترجمہ)

جب سے ہاشمی صاحب نے فرمایا ہے کہ تم کو اندلس کے جغرافیہ پر اس مجلس میں تقریر کرنی ہوگی اُسوقت سے حیران ہوں کہ اس مضمون پر ایک ایسی انجمن میں جہاں مذہب وحکمت سائنس وفلسفہ کے اساتذہ اور فن تاریخ اور آثار قدیمہ کے ماہر موجود ہوں وہاں میں کیونکر اپنی زبان کھول سکتا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ میں نے برسوں کی محنت میں بہت سی کتابیں اور جغرافیے نقشے دیکھکر اندلس کے متعلق جغرافی معلومات کو اس غرض سے یکجا کیا ہے کہ اسپین و پرتگال میں اسلامی عہد حکومت کی تاریخیں سمجھ کر پڑھی جاسکیں۔ لیکن اہل علم کے مجمع میں ایسے کسی کام کو پیش کرنا یا اس پر گفتگو کرنی ایسی ہی ہے جیسے کوئی پٹواری گانوں کے کھیتوں کا نقشہ یا کھتونی پیش کرکے اُس پر اپنی بکواس شروع کرے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اندلس کے جغرافیہ میں قطع نظر اس دلچسپی کے وہ پرانے اسلامی اسپین اور پرتگال کا جغرافیہ ہے جو چیزیں زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی ہیں ان میں ایک چیز یہ بھی ہے کہ پرانے عربی شہروں اور مقامات کی تطبیق آج کل کے شہروں اور مقامات سے کی گئی ہے۔ زمانہ دراز گزرنے سے

ناموں میں جو ردو بدل ہوا اور انھوں نے جو عجیب شکلیں اختیار کیں ان کا ذکر دلچسپ ہے۔ بہر کیف اسی مضمون پر چند باتیں عرض کرتا ہوں۔ لیکن مناسب ہو گا کہ پہلے کچھ جغرافیہ کی نسبت عرض کروں۔

اب تو یہ فن اسقدر مشکل اور پیچیدہ ہوگیا ہے کہ اس کے متعلق میں کچھ بھی نہیں جانتا لیکن پرانے زمانہ کے جغرافیہ کی نسبت جبکہ بہت کچھ اس فن کا حصر سیاحوں کے بیان پر تھا چند موٹی باتیں عرض کرتا ہوں۔

جغرافیہ وہ علم ہے جس میں کرۂ ارض کی تقسیمیں بیان کی جاتی ہیں اور ان میں جو بڑے بڑے مقامات آتے ہیں ان کے حالات سے واقفیت پیدا کرائی جاتی ہے زمین کی نوعیت پیداوار کی اقسام موسموں کی کیفیت باشندوں کے حالات وغیرہ وغیرہ تفصیل کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں۔ جغرافیہ کے ساتھ جغرافی نقشے بھی ہوتے ہیں۔ جغرافی نقشے کی تعریف یہ ہے کہ وہ کرۂ ارض یا اُس کے کسی حصہ کا ایک مرقع ہوتا ہے جو کسی مسطّح وہموار شئے پر بنایا جاتا ہے اور جس میں ریاضی اور ہیئت کی مدد سے زمین کی تقسیمیں اس طرح درج کیجاتی ہیں کہ ان کے باہمی فاصلے اور سمتیں اور مشہور مقامات کے صحیح موقعے ذہن نشین ہو جائیں۔ کرۂ ارض کی جن تقسیموں سے جغرافیہ کو بحث ہوتی ہے وہ دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک قدرتی دوسری عارضی یا مصنوعی۔ قدرتی تقسیموں میں براعظم۔ جزیرے۔ دریا۔ پہاڑ۔ گھاٹیاں وغیرہ ہیں۔ مصنوعی تقسیموں میں ملک۔ سلطنتیں۔ صوبے۔ اضلاع۔ شہر۔ وقصبات وغیرہ ہیں۔ قدرتی تقسیموں میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔ سمندر۔ پہاڑ۔ جزیرے جہاں ہمیشہ سے ہیں وہیں ہیں۔ دریا کچھ ہٹتے ہیں تو کہیں صدیوں میں تھوڑا سا فرق آتا ہے۔ لیکن بڑا فرق ملک کی عارضی اور مصنوعی تقسیموں میں ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً ملکوں اور

سلطنتوں کی وسعت و نوعیت میں۔ صوبوں اور اضلاع کی حدود میں۔ شہروں کی تعمیر و شکست میں۔ قصبات اور قلعوں کے بننے اور بگڑنے میں بالخصوص تاریخی انقلاب کے زمانہ میں کچھ نہ کچھ ردّو بدل ہوجاتا ہے۔ تاریخ میں ان ہی چیزوں کا اکثر ذکر آتا ہے۔ لیکن ان کے مفصّل حالات جغرافیوں میں اور جغرافیوں کو سمجھانے کے لیئے جو نقشے تیار کیئے جاتے ہیں اُن میں مذکور ہوتے ہیں۔ کسی ملک کی تاریخ سے بھی۔ تا وقتیکہ اس ملک کے جغرافیئے اور جغرافی نقشہ سے واقفیت نہ ہوگی تاریخ کے بہت سے حصّے اچھی طرح سمجھ میں نہ آئینگے۔ ہر ملک کے لیئے یہ ہی قاعدہ ہی لیکن ایسی پرانی تاریخوں کو سمجھ کر پڑھنے کے لیئے جو عروج و زوال کی منزلیں طے کرکے کبھی کی ختم ہوچکی ہیں جغرافی حالات اور بھی وسیع پیمانہ پر معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اس زمانہ کے شہر۔ قریے قلعے یا تو برباد ہوگئے ہیں یا جو باقی ہیں ان کے ناموں میں ایسا تغیر ہوگیا ہے کہ اسبات کا ٹھیک پتا چلانا کہ یہ وہی شہر ہیں جن کا پُرانی تاریخ میں ذکر آتا ہے مشکل ہوجاتا ہے بس تاریخ اور جغرافیہ میں ایک بڑا تعلق ہے اور یہ تعلق ایسا ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ تاریخ کو سمجھ کر پڑھنے کے لئے جغرافیے اور جغرافی نقشے کیوں ضروری ہوجاتے ہیں اس کو میں آپ کے سامنے ایک مثال سے بیان کرونگا جو کسی قدر طویل ہے مگر میرا مطلب ادا ہوجاتا ہے۔

مثلاً ایک تصویر لیجئے جس میں آدمی۔ جانور۔ مکان اور پہاڑ بنے ہیں۔ یہ سب چیزیں۔ ابعاد ثلاثہ رکھتی ہیں۔ لیکن مُصوّر نے اپنے فن کے مطابق اُن کو ایک ہی سطح پر اس طرح بنایا ہے کہ دیکھنے والے کو وہ اپنے موقع اور محل پر آپس کا قرب و بعد بلندی اور نشیب دکھاتی ہوئی مجسم نظر آئیں۔ اب یہ تصویر ایک شخص کو دیجئے جس کو تصویر دیکھنے کی اٹکل نہ ہو۔ اور پوچھیئے کہ تصویر میں آپ کیا دیکھتے ہیں۔

پہلے تو اس کو دیکھ کر شاید وہ لاحول پڑھیگا۔ پھر کہیگا کہ صاحب اس تصویر میں تو ایک آدمی گھوڑے پر سوار ہے۔ اور یہ دونوں ایک قلعے کی دیوار سے بالکل ملے ہوئے نظر آتے ہیں اور تعجب یہ ہے کہ قلعے کی دیوار جس کو بلند ہونا چاہئے تھا اس قدر نیچے ہے کہ سوار کے شانوں تک آتی ہے اور سب سے حیرت کی بات یہ ہے کہ گھوڑے کے سر پر ایک ہاتھی بنا ہے جو ڈیل ڈول میں گھوڑے کے سر سے بھی چھوٹا ہے اور ہاتھی کے اوپر کچھ الٹی سیدھی لکیریں کھچی ہیں۔

اس بیان میں تصویر کی تقریباً کل چیزیں آگئیں لیکن ان کی صحیح کیفیت دیکھنے والے کی سمجھ میں نہیں آئی۔

اب میں آپ سے عرض کروں گا کہ ذرا اس تصویر کو سیر بین میں لگا کر تو دکھائے اور پوچھئے کہ اب آپ کیا دیکھتے ہیں۔

اب یہ شخص کہیگا کہ حضرت اب تو بات ہی کچھ اور ہو گئی۔ گھوڑا اور سوار جو پہلے قلعہ کی دیوار سے بالکل وصل نظر آتے تھے دیوار سے فاصلے پر ہیں۔ اور قلعہ کی دیوار گھوڑے اور سوار کے قد سے اب کہیں بلند نظر آتی ہے۔ اور ہاتھی گھوڑے کے سر پر نظر نہیں آتا بلکہ وہ تو بہت دور ایک طرف کو جا رہا ہے۔ ہاتھی سے کوسوں فاصلے پر کچھ پہاڑ دکھائی دیتے ہیں جن کو میں پہلے الٹی سیدھی لکیریں سمجھا تھا۔

اس دوسرے بیان سے معلوم ہوا کہ چیزیں وہی ہیں جو پہلے دیکھی تھیں مگر اب ان کی صحیح کیفیت دیکھنے والے کی سمجھ میں آگئی۔

میرے خیال میں یہی حال تاریخ و جغرافیہ اور جغرافی نقشوں کا ہے۔ تاریخ اگر انسان کے واقعات گذشتہ کی ایک تصویر ہے تو اس کے بہت سے حصوں کے سمجھنے کے لئے

جغرافیہ اور جغرافی نقشے سیر بین کا کام دیتے ہیں۔ ایک مقام کا تعلق دوسرے مقام سے صحیح صحیح معلوم ہو جاتا ہے ان کے باہمی فاصلے اور سمتیں اور جو چیزیں ان کے درمیان حائل ہوئی ہیں مثلاً دریا۔ پہاڑ۔ کوہی یا ہموار زمینیں وہ سب دریافت ہو جاتی ہیں۔ دماغ روشن ہو جاتا ہے اور تاریخ کے ان حصوں کے پڑھنے کا لطف جہاں ان چیزوں کا ذکر زیادہ آیا ہے بڑھ جاتا ہے۔

اسوقت مجھ کو اندلس کی تاریخ اور جغرافیہ سے بحث ہے۔ اندلس سے مسلمانوں کی حکومت کو اٹھے ہوئے کچھ کم ایک ہزار برس ہونے کو آتے ہیں۔ پس یہ بھی ایک پرانی تاریخ ہے جس کی کتاب ختم ہو چکی ہے اور جس کو سمجھ کر پڑھنے کے لیے جغرافیوں اور نقشوں کی بیحد ضرورت ہوتی ہے اور اگر یہ چیزیں میسر آجائیں تو بہت سے تاریخی واقعات جن کی تصویر پہلے دھندلی اور اکثر غلط دکھائی دیتی تھی نظر میں روشن اور صحیح معلوم ہونے لگیں۔

اب میں تاریخ اندلس سے اس کی چند مثالیں آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں۔

میں نے اندلس کی تاریخ کا مطالعہ انگریزی کتابوں سے شروع کیا: مثلاً ایک انگریزی تاریخ میں پڑھا۔

"موسیٰ بن نصیر والی افریقیہ کے حکم سے اس کا ایک فوجی سردار طارق بن زیاد سات ہزار کا لشکر لیکر سوٹا سے آبنائے جبرالٹر کو عبور کر کے اسپین کے ساحل پر ایک پہاڑ کے نیچے اترا جس کا نام اس کے نام پر جبرالٹر ہو گیا۔ اس پہاڑ کے نیچے فوج کو درست کر کے اُس نے کارٹیا کا شہر فتح کر لیا اور اس مقام سے وہ لاگونا ڈی لا جنڈا۔ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ خبر آئی کہ اسپین کا عیسائی بادشاہ ایک بڑی فوج لیکر مقابلہ کو آرہا ہے۔ چنانچہ اس بادشاہ سے طارق کا مقابلہ دریائے بارباٹی یا دیجر کے قریب ہوا۔ طارق کو فتح ہوئی اور اُس نے آگے بڑھ کر اسیجا کا شہر فتح کر لیا۔ اور اپنے تین سرداروں کا حکم دیا کہ کورڈووا۔ آرچی ڈونا

اور الویرا کی فتح کے لئے روانہ ہوں۔ طارق خود ٹولیڈو کی فتح کے لئے آگے بڑھا۔"

صرف اتنا پڑھ کر طبیعت کو سیری ممکن نہ تھی۔ شوق ہوا کہ اس عبارت میں جو مقامات آئے ہیں ان کو جغرافی نقشوں میں دیکھنا چاہیے کہ وہ کہاں ہیں۔ چنانچہ آفریقہ اور اسپین کا انگریزی نقشہ دیکھا اور یہ کل مقامات تھوڑی بہت کوشش کے بعد مل گئے۔ اور اب معلوم ہوا کہ سوٹا افریقہ کا ایک شہر ہے جو سمندر کے کنارے سے قریب ہے اور اسی سمندر کو آبنائے جبرالٹر کہتے ہیں جس کی چوڑائی اس پہاڑ تک جہاں طارق نے اپنی فوج اُتاری تھی تقریباً ۱۸ میل ہے۔ یہ پہاڑ سوٹا سے شمال کی جانب ہے اور اس کا نام جبرالٹر ہے۔ یہاں سے کارٹیا کا شہر پانچ چھ میل کے فاصلے پر سمت شمال مغرب میں تھا اور کارٹیا سے مغرب کی سمت میں تقریباً ۲۵ میل پر لاگوناڈی لاجندا ہے۔ اور اس سے بہت قریب بارباٹ کا دریا ہے جس کے قریب طارق اور اسپین کے عیسائی بادشاہ میں لڑائی ہوئی تھی۔ اس مقام جنگ سے اسیجا شمال مشرق میں تقریباً ۱۱۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ بیچ میں کئی دریا اور ایک پہاڑی سلسلہ ہے جن سے طارق کا گذر ہوا ہوگا۔ اسیجا سے کورڈووا شمال مشرق میں تقریباً ۲۵ میل کے فاصلہ پر ہے اور اسیجا سے آرچی ڈونا جنوب مشرق میں تقریباً ۵ میل کا فاصلہ رکھتا ہے۔ اور اس سے نصف فاصلے پر سمت مشرق میں الویرا ہے اور اسیجا سے ٹولیڈو تقریباً ۱۶۰ یا ۱۷۰ میل دور شمال مشرق کی سمت میں ہے۔ شہر تک پہونچنے کے لئے ایک بڑا دریا ٹیگس عبور کرنا ہوتا ہے اور اسیجا سے کچھ دور چلنے کے بعد ایک بڑا دریا گوادل کوی در اور ایک پہاڑی سلسلہ واقع ہے۔

یہ سب باتیں نقشوں سے معلوم ہوگئیں اور اب اُن سے اتنا سمجھ میں آیا کہ اسلامی لشکر کا پہلا ہی سیلاب اپنے زیادہ سے زیادہ عرض میں ۱۳۰ میل اور طول میں تقریباً ۲۷۰ میل

ملک پر پھر گیا۔ مسلمانوں کی ہمت و جرأت کا اندازہ ہوا اور تاریخ پڑھنے کا شوق بڑھا۔ اگر صرف شہروں کے نام جس طرح بیان ہوئے تھے پڑھ لئے جاتے تو اسلامی لشکر کا یہ مارچ کچھ بھی سمجھ میں نہ آتا۔

لیکن اب یہ بے چینی ہوئی کہ یہ مقامات دارالخلافت سے ہزار ہا میل کے فاصلے پر جنکو مسلمانوں نے فتح کیا اور جہاں بعد کو صدہا برس تک حکومت بھی کی کیا اہل عرب ان کو سوٹا۔ اسٹریٹس آف جبرالٹر۔ کارٹیا۔ لاگوناڈی لاجنڈا۔ بارباٹ۔ اسیجا۔ گوا ڈل کوی ور۔ کورڈووا۔ آرچی ڈونا۔ الویرا۔ ٹیگس اور ٹولیڈو ہی کہتے تھے۔ ان میں بعض نام تو ایسے ہیں کہ عربوں کی زباں سے ادا بھی نہ ہو سکتے تھے۔ جس طرح ہو ان کے عربی نام جس طرح عربی تاریخوں یا جغرافیوں میں آئے ہوں ان کو معلوم کرنا چاہیے۔

یہ مرحلہ کہیں آسان اور کہیں از حد مشکل کہیں سب سے زیادہ وقت کا لینے والا۔ کہیں سب سے بڑھ کر مایوس اور کہیں سب سے زیادہ خوش کرنے والا ثابت ہوا۔ بہر کیف جو یندہ یابندہ کہیں مشکل سے اور کہیں آسانی سے عربی نام مل گئے اب سنئے۔ سوٹا تو سبتہ ہے۔ آبنائے جبرالٹر' بحر زقاق ہے۔ جبرالٹر جبل طارق ہے۔ کارٹیا کو قرطاجیہ کہتے تھے۔ لاگوناڈی لاجنڈا کا عربی نام فقط البحیرہ تھا۔ بارباٹ دریا وادی رباط ہے۔ اسیجا کو استجہ اور کہیں کہیں سجہ بھی لکھا ہے۔ گوادل کوی ور وادی الکبیر ہے۔ کورڈووا کو تو سب جانتے ہیں قرطبہ کہتے تھے۔ آرچی ڈونا کو ارجذونہ یا ارشذونہ۔ الویرا کو مدینۃ البیرہ ٹیگس کو تاجہ اور ٹولیڈو کو طلیطلہ کہتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ انگریزی میں تاریخ اندلس پڑھکر اور انگریزی نقشوں سے مدد لیکر مقاموں کے اسپینی نام ان کے باہمی فاصلے اور سمتیں معلوم ہوئیں اور عربی جغرافیوں اور تاریخوں

میں مقاموں کے عربی نام ڈھونڈنے پڑے۔ عربی کے جغرافی نقشے ایسے دستیاب نہ ہوے جو انگریزی نقشوں سے بے نیاز کردیتے مگر طبیعت نے اس پر بھی بس نہیں کی۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں نے جب یہ شہر فتح کئے تو اس وقت ان کی حیثیت کیا تھی۔ مسلمانوں سے پہلے اس ملک پر قوطی مسلّط تھے۔ قوطیوں سے پہلے رومانیوں نے بڑی شان سے یہاں حکومت کی تھی اور ان سے بھی پہلے ساحل پر کہیں کہیں یونانیوں نے اپنے شہر بسائے تھے۔ اور ان یونانیوں سے بھی پہلے شام کی ایک قوم جس کا یونانی نام معرب کرکے اب فنیقی لکھا جاتا ہے اس ملک میں آئی تھی اور اس کے لوگوں نے اسپین کے جنوبی اور مغربی ساحل پر تجارت کے لئے بستیاں بسائی تھیں۔ ہر قوم نے جو پورے ملک یا اس کے کسی حصے کی مالک ہوئی یا تو پرانے شہروں کو رونق بخشی یا ان کو برباد کیا یا برباد شہروں کو ازسرنو آباد کیا یا بالکل نئے شہر اور قلعے تعمیر کئے۔ یہی مسلمانوں سے پہلے ہوتا آیا تھا یہی مسلمانوں نے اور مسلمانوں کے بعد اوروں نے کیا۔ غرض اس تفتیش میں جو شہر یا قلعے مسلمانوں نے فتح کئے ان کی نسبت تین باتیں معلوم کرنے کی ضرورت ہوئی۔ مسلمانوں سے پہلے انکی کیا حیثیت تھی۔ مسلمانوں کی فتح کے بعد ان کے زمانہ حکومت میں ان کی کیا حالت رہی اور جب مسلمان چلے گئے تو ان کی کیا حالت ہوئی یا یہ کہ اب وہ کس حال میں ہیں۔ اسکے معنی یہ ہوئے کہ اندلس کی پرانی اسلامی تاریخ کو لطف و ذوق کے ساتھ پڑھنے کے لئے تین قسم کے جغرافیوں اور جغرافی نقشوں کو دیکھنے کی ضرورت ہوئی۔ (۱) ایک جغرافیہ اور نقشے تو وہ جو اسلامی عہد سے پہلے کے تھے۔ (۲) دوسرا جغرافیہ اور نقشہ وہ جو اسلامی عہد میں اس ملک کا تھا۔ (۳) تیسرا جغرافیہ اور نقشہ وہ جو اس ملک کا مسلمانوں کے بعد یا زمانہ حال میں ہے۔ اس تحقیقات سے ماضی و حال کا تعلق ظاہر ہوا اور مضمون کی

دلچسپی بڑھتی ہی گئی۔

طارق کا سلسلۂ فتوحات میں نے ناتمام چھوڑا ہے۔ اب چند اور شہروں کے نام سنئے طلیطلہ میں پہونچکر طارق نے دم نہیں لیا۔ اس شہر کو جو قوطی بادشاہوں کا دارالحکومت تھا فتح کر کے طارق آگے بڑھا۔ اور اب آپ انگریزی تاریخوں میں پڑھینگے۔

"طارق ٹولیڈو سے چلکر ایک مقام پر پہونچا جس کو آج کل الکالادی ہنارییس کہتے ہیں اور اس پر قبضہ کر کے یا تو خود اس مقام پر آیا جسکا نام بعد کو گواڈل اہارا ہوا یا اپنے کسی سردار کو اس مقام کی فتح کے لئے روانہ کیا اور خود گواڈارا ما کے پہاڑی سلسلہ کو ایک درے سے عبور کر کے جس کا نام طارق کے نام پر بوٹ راگو ہو گیا اسٹورگا کے فتح کے لئے چلا گیا۔"

اب یہاں پھر ان اسپینی مقامات کے باہمی فاصلے اور سمتیں تلاش کرنے کی جستجو ہوئی چنانچہ معلوم ہوا کہ ٹولیڈو سے الکالادی ہنارییس سمت شمال شرق میں تقریباً ۵۵ میل کے فاصلے پر ہے اور اس سے شمال میں تقریباً ۳۰ میل پر گواڈل اہارا ہے اور یہاں سے تقریباً ۲۵ میل شمال پر بوٹ راگو کا درہ ہے اور بوٹ راگو سے شمال شرق میں تقریباً ۱۴۰ میل پر اسٹورگا کا پرانا شہر ہے۔ اب ان مقامات کے عربی نام معلوم کئے تو دریافت ہوا کہ الکالادی ہنارییس کو مسلمان القلعتہ النہر کہتے تھے گواڈل اہارا وادی الحجارہ ہے۔ گواڈارا ما۔ وادی رملہ ہے۔ بوٹ راگو باب طارق کی خرابی ہے۔ اسٹورگا کو اہل عرب اشتورقہ یا استرقہ کہتے تھے۔

اب طارق کے اس فوجی گذر کے تمام مقامات ان کے فاصلے اور سمتیں معلوم کر کے یہ سمجھ میں آیا کہ غالباً سال ڈیڑھ سال کے اندر طارق اور اس کا لشکر جنوب میں جبل طارق

سے لیکر شمال کی سمت میں کچھ کم چھ سو میل کی راہ طے کر کے شہر اور قلعے فتح کرتا ہوا استرقہ پہنچ گیا جو اسپین کے بالکل شمال مغربی علاقہ کا ایک پرانا شہر ہے۔ اگر محض شہروں کے نام جیسے کہ وہ انگریزی یا عربی تاریخوں میں بیان ہوئے ہیں پڑھ لئے جاتے اور نقشوں پر ان کو بچشم خود نہ دیکھا جاتا تو کیا نظر کو اتنی وسعت ہو سکتی تھی جو اس مشقت سے ہوئی۔ میرے خیال سے تو ہرگز ایسا نہ ہوتا بلکہ اس بے اٹکل تصویر کے دیکھنے والے کی طرح کہ گھوڑے کے سر پر ہاتھی اور ہاتھی کے سر پر پہاڑ ہے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا۔

اب ذرا مقامات کے عربی ناموں پر غور فرمائیے۔ اسوقت تک میں نے صرف ۱۸ نام آپ کے سامنے بیان کئے ہیں۔ اس قسم کے تقریباً ۹۰۰ نام مجھ کو مل چکے ہیں مگر میں نے یہاں صرف طارق کے قومی مارچ میں جو نام آئے ہیں وہ بیان کئے ہیں۔ ان اٹھارہ ناموں میں سے دس نام یعنے سبتہ۔ قرطاجیہ۔ برباط۔ استجہ۔ قرطبہ۔ ارجذونہ۔ البیرہ۔ طلیطلہ۔ تاجہ۔ اشتورقہ۔ ایسے نام ہیں جو اہل عرب نے غیر زبان کے اپنے لب ولہجہ میں ادا کئے۔ باقی آٹھ نام یعنے بحر زقاق۔ جبل طارق۔ البحیرہ۔ وادی الکبیر۔ القلعتہ النہر۔ وادی الحجارہ۔ باب طارق وادی رملہ بالکل عربی نام ہیں۔ ان میں سے دو نام یعنی البحیرہ اور وادی الحجارہ۔ ایسے ہیں جنکو اسپینی ناموں کا عربی زبان میں ترجمہ کہنا چاہئیے۔

اس سے ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ عربوں نے اندلس فتح کر کے مقامات کے نام لینے یا نام رکھنے میں تین صورتیں تو ضرور اختیار کیں۔

(۱) فتوحات کے وقت یا بعد کو زمانہ امن میں جو نام انھوں نے اہل اسپین کے منہ سے سنے ان کو عربی لب ولہجہ میں ادا کیا یعنے ان کو معرب کر لیا۔

(۲) یا اسپینی نام سنکر ان کا ترجمہ عربی میں کر لیا اور وہ ہی ان کا نام قرار دیا۔

(۳)۔ خالص عربی نام رکھے۔

صورت اول کی یعنی جو نام معرب کر لئے گئے صدہا مثالیں ہیں۔ اس وقت صرف چند مثالیں علاوہ ان کے جو بیان کر چکا ہوں بیان کر سکتا ہوں مثلاً ولبہ اوبنہ۔ قادس۔ ماردہ اشبیلیہ۔ مرسیہ۔ بلنسیہ۔ قونکہ قشتیلیون۔ قاصرش۔ وابلہ۔ شقونیہ مجریط۔ طلمنکہ۔ لیون۔ سرقسطہ۔ لاردہ۔ بنبلونہ۔ وغیرہ وغیرہ یہ سب غیر زبان کے لفظ معرب کئے گئے ہیں۔ اس صورت اول میں یہ معلوم کرنا دشوار ہوتا ہے کہ عربوں نے یہ نام لاطینی شکل میں سنے تھے یا اسپینی شکل میں کیونکہ لاطینیوں کی حکومت دراز کی وجہ سے بہت سے شہر لاطینی شکل کے نام رکھتے تھے۔ یہاں محققوں نے قیاس سے کام لیا ہے مثلاً آج کل اسپین کے دارالحکومت کا نام میڈرڈ ہے۔ اس کو اہل عرب مجریط کہتے تھے۔ اس شہر کا لاطینی نام میجورتُم تھا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہل عرب نے میجورتُم سنکر عربی میں اس کو مجریط کہا یا میڈرڈ کا نام سنا تھا اور اس سے مجریط بنا لیا۔ زیادہ تر قیاس یہ ہے کہ میجورتُم سنکر مجریط بنایا اور موجودہ نام میڈرڈ اس مجریط کی خرابی ہے۔ اسی طرح پرتگال کا دارالحکومت جس کو آجکل لسبن کہتے ہیں لاطینیوں کے عہد میں اس کا نام اولسیپا تھا۔ اہل عرب نے اس شہر کو اشبونہ بالعموم اور لشبونہ کہیں کہیں کہا ہے۔ اب یہ بتانا مشکل ہے کہ اولسیپا سنکر اشبونہ یا لشبونہ بنایا گیا یا یہ نام اہل عرب کی آمد کیوقت میں بھی لسبن تھا اور اس سے عربوں نے اشبونہ یا لشبونہ بنایا۔ یہاں بھی خیال یہی کیا گیا ہے کہ غالباً اولسیپا سے اشبونہ یا لشبونہ بنایا ہے۔ اسی طرح شمال مشرقی اندلس کے ایک بڑے شہر کا لاطینی نام کیزراگسٹا تھا جس کو آجکل زاراگوزا کہتے ہیں۔ عربوں نے اس شہر کو سرقسطہ کہا۔ یہاں صرف یہ گمان ہوتا ہے کہ اہل عرب نے لاطینی نام کیزراگسٹا سن کر اس کو اپنے لہجے میں غالباً پہلے قیصر اغسطہ کہا ہوگا اور پھر اس کو مخفف کر کے سرقسطہ کہنے لگے

اور اب جو زارا گوزا کہا جاتا ہے غالباً وہ اسی معرب نام کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ بہرکیف ان باتوں کا فیصلہ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ ہم کو یہ معلوم ہو کہ پہلی صدی ہجری کے آخری حصہ میں جبکہ مسلمانوں نے اندلس فتح کیا اسپین میں اس کے مقامات کے نام مسلمانوں نے کس شکل میں سنے تھے۔ اور پھر ان کو معرب کیا تھا۔

دوسری شکل یعنے اسپینی یا لاطینی ناموں کا عربی میں ترجمہ کر لیا۔ اس کی دو مثالیں یعنے البحیرہ اور وادی الحجارہ پہلے بیان کر چکا ہوں۔ تفصیل یہ ہے موجودہ صوبہ قادس میں ایک جھیل ہے جس کو اسپین کے لوگ لگونہ یا لاگو کہتے ہیں جس کے معنی جھیل کے ہیں اس کو عربوں نے اپنی زبان میں البحیرہ ترجمہ کر دیا اور اسی نام سے اس جھیل کو پکارنے لگے۔ اسی طرح اسپینی نام کا ایک شہر آری آکا تھا جو دریائے آراس کے کنارے واقع تھا۔ اراس کا لفظ پرانی اسپینی زبان کے ایک لفظ آری سے مشتق ہے جس کے معنی پتھر کے ہیں۔ جب مسلمان اس دریا پر پہونچے اور آری آکا کے شہر کو فتح کیا تو انھوں نے غالباً اسی لفظ آری کی رعایت سے پہلے تو دریا کو اور پھر اس مفتوحہ شہر کو وادی الحجارہ کہا اور ایسا کہا کہ پھر آری آکا کا نام مفقود ہو گیا چنانچہ اس شہر کو اب تک گوادل آہارا کہتے ہیں جو وادی الحجارہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ (یہاں ایک لطیفہ یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب اردو میں عربی کی ایک تاریخ ترجمہ ہوئی تو مترجم صاحب نے بجائے اس کے کہ وادی الحجارہ کو ایک مقام کا نام سمجھ کر یوں ہی لکھدیتے اس کا بھی ترجمہ کر ڈالا اور پتھریلی گھاٹی لکھ گئے۔ عربی سے اردو ترجموں میں اس قسم کے لطیفے اور بھی ملتے ہیں جو مترجموں کی سستی و بے پروائی کا ثبوت ہے۔ لاطینی نام کو ترجمہ کر دینے کی ایک اور مثال عرض کروں۔ مشرقی اندلس کا ایک دریا تھا جس کا نام لاطینی میں توریا فلے دیا تھا یعنے سفید دریا۔ اس کو اہل عرب نے اپنی زبان میں وادی الابیض

کہا اور ایسا کہا کہ اب تک یہ دریا گوادل اوبیر کہلاتا ہے جو وادی الابیض کی خرابی ہے۔ توریا کوئی نہیں کہتا۔ یا مثلاً اندلس کے مشرقی جنوبی گوشے پر ساحل سے قریب ایک جزیرہ تھا جس کا لاطینی نام ایلاگروسا تھا جس کے معنی چوہوں والے جزیرے کے ہیں۔ اہل عرب نے اسکو اپنی زبان میں ترجمہ کر کے محض فیران یا جزیرہ فیران کہا۔ یا مثلاً بحر رفاق میں اندلس کے ساحل سے بہت ہی قریب ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا جس کا لاطینی نام آیلا دردی تھا جس کے معنی سبز جزیرہ کے ہیں اس کو عربوں نے جزیرۃ الخضرا کہا اور اسی کی رعایت سے سامنے ساحل پر جو شہر آباد ہوا اسکو بھی یہی نام دیدیا جو اب تک الجسیراس لکھا یا جاتا ہے اور یہ جزیرۃ الخضرا کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس کی اور مثالیں بھی مل سکتی ہیں۔

تیسری صورت یعنے خالص عربی نام رکھے اس کی صدہا مثالیں اب تک ملتی ہیں اور میرے خیال میں ہزاروں ایسی ہونگی جن پر ابھی تک لاعلمی کا پردہ پڑا ہے۔ اسکی چند مثالیں بیان کرتا ہوں۔ مثلاً دریائے بےٹس کا نام جس کے کنارے قرطبہ آباد ہے چونکہ وہ بہت بڑا دریا نظر آیا اس لئے اس کا نام وادی الکبیر رکھدیا اور یہ نام ایسا رکھا کہ بےٹس کو سب بھول گئے اور ابتک اس کو گوادل کوی ور کہا جاتا ہے۔ ہزاروں قلعے اور قریئے بیسیوں شہر جو خود تعمیر اور آباد کئے ان کے نام اپنی زبان میں رکھنے ضروری تھے۔ ان میں سے چند ایسے عربی نام سناتا ہوں جو اسپینی زبان میں عجیب شکلیں اختیار کر کے ابتک ملک میں بولتے ہیں۔ مثلاً قلعہ رباح اس کو آجکل کلاٹ رادا کہا جاتا ہے۔ قلعہ ایوب۔ یہ کلاٹا یوڈ بولا جاتا ہے۔ مدینہ سالم اس کو میڈینا سیلی کہتے ہیں۔ قریہ نبی کنانہ اس کو خمینا کہتے ہیں۔ قریہ نبی سلیم اس کا نام آجکل اس طرح لکھا جاتا ہے جس کو ہم گراسالمہ پڑھ سکتے ہیں۔ حصن المدوّر۔ اسکو المیڈوورڈیل ریو کہتے ہیں یعنے دریا والا المدوّر۔ قلعہ نبی سعید کو کاسر بن زیدی یا الکالہ لاریال کہتے ہیں پرتگال

میں ایک صوبے کا نام عربوں نے مغرب میں واقع ہونے کی وجہ سے الغرب رکھدیا تھا یہ ایک الگاروی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی اور بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ اگر کسی بڑے اٹلیس میں مقامات کے ناموں کی فہرست جو نقشوں میں دکھائے گئے ہیں دیکھئے تو بیسیوں نام اسپین میں ابتک ایسے ہیں جو بن کے لفظ سے شروع ہوتے ہیں یہ سب چھوٹے چھوٹے قصبے اور شہر ہیں جو کسی وقت میں قبائل عرب اور بربر بنی فلاں اور بنی فلاں نے بنائے تھے۔ مگر اسپینی زبان کی شکلیں ایسی بگڑ گئی ہیں کہ عربی نام کا پتہ نہیں چلتا۔ اور نہ عربی جغرافیوں میں ایسے نام بجز دو چار کے ملتے ہیں۔

غزل

(نواب صدر یار جنگ بہادر شروانی بالقابہ)

برطرح خواجہ آتش لکھنوی:

خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بُو تیری

خوشا وہ باغ مہکتی ہو جس میں بُو تیری
خوشا وہ دشت کہ ہو جس میں جستجو تیری

خموش ہے مگر اک عالم تکلّم ہے
دہانِ غنچہ پہ گویا ہے گفتگو تیری

رہینِ صحنِ گلستاں نہیں دل افزائی
شمیمِ لطف دل افزا ہے کو بکو تیری

طریقِ اہلِ نظر میں ہے منع یکسوئی
زبسکہ جلوہ فروزی ہے سو بہ سو تیری

ہنوز دشتِ ختن نافہ زارِ عالم ہے
کبھی کھلی تھی ادھر زلفِ مشکبو تیری

فرشتۂ اجل آئے پری کے قالب میں
بوقتِ مرگ جو صورت ہو روبرو تیری

خیالِ لطف سے حسرت ہے باغِ رضواں میں
سنا ہے جب سے کہ لطف و کرم ہے خو تیری

حکیم آین شٹاین کا نظریۂ اضافیت

حصہّ اوّل

نظریۂ اضافیت (خاص)

ڈاکٹر مظفر الدین صاحب قریشی ایم ایس سی ۔ پی ایچ ۔ ڈی پروفیسر کلیۂ جامعۂ عثمانیہ

اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ نظریۂ اضافیت کو ایسی زبان میں جو ریاضی سے معرّا اور پیچیدہ منطق سے مبرّا ہو بیان کرنے کی کوشش کی جائے ۔ لیکن ظاہر ہے کہ طبیعات کی اصطلاحات سے چارہ نہیں لہذا اوّل ان اصطلاحات کے معنی سمجھ لینے چاہئے جن سے نظریہ اضافیت بحث کرتا ہے ۔ میری نظر میں بہترین صورت اس کی یہ ہے کہ طبیعیات کے دو بڑے حصوں علم الحیل اور علم النور کے اساسی اصولوں کا ایک مختصر سا خاکہ آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے ۔

علم الحیل کی ابتدا قوت کے خیال سے ہوئی ۔ یہ خیال دراصل تکان و تکلیف کے اس ذہنی احساس کا نام ہے جو جسمانی کام کرتے وقت پیدا ہوتا ہے ۔ لیکن اس احساس کے علاوہ قوت ایک خارجی اثر بھی رکھتی ہے جو حرکت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ۔ پتھر اٹھانے والے ہاتھ کی قوت سے پتھر میں ۔ گھوڑے کی قوت سے بگھی میں اور بھاپ کی قوت سے ریل گاڑی میں حرکت کا ظہور ہوتا ہے ۔ یہ بنی نوع انسان کا ایک دیرینہ مشاہدہ ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ آغاز عالم سے انسان اس واقعہ کا مشاہدہ کرتا چلا آیا ہے ۔

اور اس مشاہدہ کو قاعدۂ کلیہ کی شکل میں یوں ادا کیا ہے کہ ”قوت حرکت کو معرضِ وجود میں لاتی ہے“۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قوتّ حرکت کو کیسے اور کس طرح وجود میں لاتی ہے۔ لیکن اس سوال کا جواب تلاش کرنے سے پیشتر اوّل حرکت کی تعریف سمجھ لینی چاہیئے۔ حرکت کسے کہتے ہیں؟ کسی چیز کے نقلِ مکان کو۔ اب ظاہر ہے کہ نقلِ مکان کے تعین کے لئے کم سے کم دو مشاہدے ضروری ہیں۔ پہلا مشاہدہ یہ کہ ایک وقتِ معیّن میں وہ چیز ایک جگہ پر موجود ہے اور دوسرا مشاہدہ یہ کہ ایک دوسرے وقت میں وہی چیز ایک دوسری جگہ پر موجود ہے۔ غرضیکہ حرکت کے تعیّن کے لئے دو باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ اُس چیز نے کتنا فاصلہ طے کیا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ فاصلہ کتنے وقت میں طے ہوا ہے۔ ان دونوں میں جو نسبت ہے اسے اصطلاح میں رفتارِ حرکت کہینگے۔

$$\text{رفتار حرکت} = \frac{\text{طے شدہ فاصلہ}}{\text{صرف شدہ وقت}}$$

گویا ایک چیز اکائی وقت میں جو فاصلہ طے کرتی ہے اُسے اس چیز کی رفتارِ حرکت کہتے ہیں اب رفتارِ حرکت کے اعتبار سے حرکت دو طرح کی ہو سکتی ہے۔ یا تو دورانِ حرکت میں رفتار حرکت ہر لحظہ یکساں رہے۔ یا اس میں کمی وبیشی واقع ہو۔ پہلی صورت میں حرکت کو غیر متغیّر کہتے ہیں اور دوسری صورت میں متغیر یا اسراع پذیر حرکت۔ اصطلاحاً اسراعِ حرکت اس اضافہ کو کہتے ہیں جو اکائی وقت میں رفتارِ حرکت میں واقعہ ہوتا ہے۔

یعنی
$$\text{اسراع} = \frac{\text{رفتارِ حرکت میں اضافہ}}{\text{وقت}}$$

اب اس دلچسپ سوال پر غور کرنا چاہیئے کہ قوت حرکت کو کیسے اور کس طرح وجود میں

لاتی ہے۔ مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ جہاں قوّت نہ ہو حرکت وجود میں نہ آئیگی۔ ایک پتھر خاموش پڑا ہے۔ جب تک اُسے حرکت دینے والا کوئی ہاتھ نہ ہوگا اور قوّت کا استعمال نہ کیا جائیگا وہ اپنی جگہ سے نہ بڑھیگا۔ یہ امر علمائے سلف پر بھی روشن تھا لیکن اس کے ساتھ ہی علمائے سلف نے یہ بھی فرض کر لیا تھا کہ جہاں حرکت ہو وہاں قوّت کا ہونا بھی لازمی ہے۔ اس فرضیہ سے واقعات کی تشریح میں بہت سی دشواریاں پیدا ہوگئیں اور علمائے سلف نے ان دشواریوں کے سُلجھانے میں بیکار دماغ سوزی سے کام لیا۔ مثلاً یہ بات سمجھ میں نہ آسکتی تھی کہ جب ایک شخص ہوا میں ایک پتھر پھینکتا ہے تو وہ پتھر ہاتھ سے نکلتے ہی کیوں نہیں رک جاتا۔ اور کیوں اپنی حرکت کو دور تک جاری رکھتا ہے! اگر حرکت کے لئے قوت کی ضرورت ہے تو وہ کونسی قوت ہے جو اس پتھر کے سفر کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ ہاتھ کی قوّت کا اثر تو اس لمحہ زائل ہو جانا چاہئے جب کہ پتھر ہاتھ سے نکلجاتا ہے۔ اس دُشواری کو جسے قرونِ اُولیٰ و وسطیٰ کی فلسفیانہ دماغ سوزی حل نہ کر سکی حکمت کے مجتہد اعظم گلیلو نے حل کیا اور جس طریقہ سے حل کیا وہی طریقہ آج حکمتِ جدیدہ کا مخصوص طریقہ کہلاتا ہے۔ گلیلو کے نزدیک یہ فرض کر لینا کہ جہاں حرکت ہو وہاں قوّت کا ہونا لازمی ہے۔ کوئی بدیہی امر نہیں۔ حرکت میں کئی چیزیں شامل ہیں مثلاً حرکت کرنے والی چیز کا مقام۔ اس کی اسراع۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قوت کا اثر ان چیزوں میں سے کسی ایک پر یا سب پر بحیثیت مجموعی پڑتا ہے اور اس امر کے فیصلہ کے لئے فلسفیانہ بحث واستدلال کافی نہیں بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ فطرت سے بذریعہ تجربہ فیصلہ طلب کیا جائے۔ چنانچہ اس نے اپنے معروف تجربوں کے ذریعہ سے (جن کا ذکر علم الحیل کی ابتدائی کتابوں میں ملسکتا ہے) علمی دنیا کو فطرت کا فیصلہ یوں سنایا کہ قوّت کا حرکت سے جو تعلق ہے وہ رفتارِ حرکت یا سمتِ حرکت کے

تبدیل کرنے تک ہی موقوف ہے۔ یعنی کسی چیز کی غیر متغیّر حرکت کے قیام کے لئے کسی قوّت کی ضرورت نہیں قوّت کی ضرورت وہیں پڑتی ہے جہاں حرکت کی رفتار یا سمت کو تبدیل کرنا مقصود ہو۔ دوسرے الفاظ میں قوت کی عدم موجودگی میں ایک ساکن جسم اپنی حالتِ سکون کو اور خطِّ مستقیم میں غیر متغیّر رفتار کے ساتھ حرکت کرنے والا جسم اپنی حرکت کو برقرار رکھتا ہے۔ اس کلیّہ کو حکمت کی اصطلاح میں جمود کا کلیّہ کہتے ہیں۔

نیوٹن نے علم الحیل کے اصولوں کو جب اجرام سماوی پر عائد کرنا چاہا تو اُسے دشواریوں کا سامنا ہوا، خود کلیۂ جمود اپنی سادگی کے باوجود اس قسم کی دشواریاں پیش کر رہا تھا اس کلیّہ کی رو سے اگر کسی جسم پر کوئی قوت عمل نہ کر رہی ہو تو اُسے خطِّ مستقیم میں غیر متغیّر رفتار کے ساتھ حرکت کرنا چاہئے۔ اب اگر کوئی ایسا جسم زمین پر حرکت کر رہا ہو تو اس میں شک نہیں کہ اہل زمین اُسے خطِ مستقیم ہی میں حرکت کرتا پائینگے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسے مشاہد کی نظر میں جو کسی دوسرے سیّارہ پر مقیم ہے یہ حرکت کیا شکل اختیار کریگی؟ ظاہر ہے کہ زمین چونکہ محور پر گردش کرتی ہے اس لئے فضا میں زمین پر سے الگ کسی مقام سے مذکورہ بالا جسم خطِ مستقیم میں نہیں بلکہ ایک خطِّ منحنی میں حرکت کرتا ہوا نظر آئیگا۔ لہٰذا جمود کا کلیّہ کوئی معنی نہیں رکھتا تاوقتیکہ کوئی ایسا مقام موجود نہ ہو جہاں یہ کلیّہ اور علم الحیل کے دوسرے اصول صحیح بیٹھتے ہوں۔ اگر زمین کو چھوڑ کر کسی اور ستارہ کا انتخاب کر لیا جائے تو بھی مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوتا کیونکہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ کسی آئندہ زمانہ میں وہ ستارہ بھی مُتحرّک ثابت ہو جائے*۔ چنانچہ نیوٹن کو ایک ایسے مکانِ مطلق

* جن ستاروں کو نیوٹن کے زمانہ میں ثابت تسلیم کر لیا گیا تھا۔ انکے متعلق تحقیق جدید نے مُتحرّک ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

یا فضا کا وجود ماننا پڑا جو اپنی ذات ہی میں غیر متحرک ہو جس پر اجسام کی موجودگی یا غیر موجودگی کوئی اثر نہ رکھتی ہو اور جس میں کلیۂ جمود اور حیل کے دوسرے اصول بالکل صحیح بیٹھتے ہوں۔ دوسری طرف نیوٹن نے زمانِ مطلق کو بھی تسلیم کیا۔ یعنی اس کے نزدیک اصلی وقت ایک ایسا بہاؤ ہے جس پر بیرونی واقعات کچھ اثر نہیں رکھتے اس طرح سے مکانِ مطلق و زمانِ مطلق کا خیال نیوٹن کے علم الحیل کا جسے اب (Classical) علم الحیل کہتے ہیں جزء لاینفک بن گیا۔ نیوٹن کا سب سے عظیم الشان کارنامہ اس عالمگیر قانون کشش (کلیۂ تجاذب) کی دریافت ہے جو ابدالاباد تک اس کے نام کو زندہ رکھیگا۔ اس نے اس امر کا ثبوت بہم پہنچایا کہ جو کشش ایک گرتے ہوئے پتھر کو زمین کے مرکز کی طرف کھینچتی ہے وہی کشش زمین کے گرد گھومتے ہوئے چاند کو یا سورج کے گرد گھومتے ہوئے سیاروں کو اپنے اپنے مداروں پر سنبھالے ہوئے ہے۔

اس سلسلہ میں یہ سوال بھی غور طلب ہے کہ اگر نیوٹن کی فضاء مطلق کے اندر کوئی نظام خطِ مستقیم میں غیر متغیر رفتار کے ساتھ حرکت کر رہا ہو تو کیا اس نظام کے ساکنوں کے پاس کوئی ایسا ذریعہ ہے جس سے وہ اپنے نظام کی حرکت کا احساس کر سکیں۔ یا بالفاظِ دیگر کوئی حیلی واقعات ایسے ہیں جو اس قسم کے متحرک نظام اور ایک ساکن نظام میں مختلف طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اس سوال کا جواب نیوٹن کا علم الحیل بھی نفی میں دیتا ہے۔ مثال کے طور پر زمین ہی کو لیجئے۔ یہ سیارہ سورج کے گرد ۳۰ کیلو میٹر فی ثانیہ کی رفتار کے ساتھ حرکت کر رہا ہے اور چونکہ سورج سے اس کا فاصلہ بہت زیادہ ہے اس لئے اس کی حرکت ایک ایسی حرکت کے مترادف خیال کی جا سکتی ہے جو خطِ مستقیم میں ہو۔ لیکن باوجود اس کے اہل زمین اس حرکت کو مطلق محسوس نہیں کرتے اور نہ کسی حیلی

تجربہ سے بلاواسطہ اُس کا ثبوت بہم پہنچا سکتے ہیں۔ اسی طرح خاموش سمندر میں اگر ایک جہاز خطِ مستقیم میں غیر متغیّر رفتار کے ساتھ چل رہا ہو تو اہل جہاز اس کی حرکت محسوس نہیں کرینگے تاوقتیکہ وہ تختۂ جہاز پر سے یا کسی سوراخ میں سے گرد و پیش یا کسی اور جہاز کو نہ دیکھیں۔ اسوقت انھیں معلوم ہوگا کہ حرکت موجود ہے۔ لیکن پھر بھی وہ وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکیں گے کہ ان کا جہاز حرکت کر رہا ہے۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ کہ گرد و پیش یا دوسرے جہاز اور ان کے جہاز کے درمیان اضافی حرکت کا وجود موجود ہے۔ اور اگر گرد و پیش سے قطع نظر کر لیا جائے اور محض جہاز کے اندر کے حِیَلی واقعات پر ہی اکتفا کیا جائے تو سرے سے حرکت ہی نامعلوم و نامحسوس رہیگی۔ مختصراً کسی ایسے نظام میں جو خطِ مستقیم میں غیر متغیّر رفتار کے ساتھ حرکت کرتا ہو تمام حیلی واقعات ٹھیک اسی طرح ظہور پذیر ہوتے ہیں جیسا کہ ایک ایسے نظام میں جو مطلقاً حالت سکون میں ہو۔ اس اصول کو پُرانے علم الحِیَل کا اصول اضافیت کہتے ہیں۔ اس کا نام اصولِ اضافیت اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس اصول کے لحاظ سے حِیَلی واقعات کے ذریعہ سے مطلق حرکت کے متعلق ثبوت بہم پہنچانا ناممکن تسلیم کیا گیا ہے۔ اس اصول کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کیونکہ آگے چل کر یہی اصول نظریۂ اضافیت کا ایک ستون قرار دیا جانے والا ہے۔

علم الحِیَل کے بعد علم النُور کے متعلق بھی چند ضروری اور اصولی باتیں سمجھ لینی چاہئیں۔ کسی مُنوّر جسم کا اثر جسے ہم نُور یا روشنی کہتے ہیں فضا میں سے گزر کر ہم تک پہنچتا ہے، وہ اثر بھی جسے ہم صوت یا آواز کہتے ہیں فضا ہی کے ذریعہ سے ہم تک پہنچتا ہے لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ موخرالذکر کے لئے فضا میں ایک مادّی چیز یعنے ہوا کا ہونا لازمی شرط ہے اور قبل الذکر کے لئے شرط نہیں۔ روشنی خلا میں سے بھی گزر سکتی ہے۔ اور

سورج اور دیگر ستاروں کی روشنی تو بلاشبہ ایسی فضا میں سے گزر کر ہم تک پہنچتی ہے جس میں ہوا یا اور کسی ایسی چیز کا موجود ہونا غیر اغلب ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی اثر یا کوئی چیز کسی ایسے مکان میں سے گزر سکتی ہے جس میں کوئی شئے موجود نہ ہو۔ کسی اثر یا شے کا لاشے میں سے گزرنا قیاس میں نہیں آسکتا۔ اس لئے حکمت کو ایک ایسی شے کا تصور ایجاد کرنا پڑا جو فضا میں ہر جگہ موجود ہو اور روشنی وغیرہ اثرات کی حامل ہو مگر محسوس نہ کی جاسکتی ہو۔ یعنی ایسی چیز جو بعض صفات میں مادہ ہو اور بعض میں مادہ سے مختلف اس حاملِ نور شئے کو ایتھر کا نام دیا گیا ہے۔ مشہور فلاسفر ڈے کارٹے نے ۱۶۳۸ء میں یہ تصوّر اختراع کیا اور اس کے بعد علمائے طبیعیات ہُک (۱۶۶۷) اور کرسچین ہائی جینز (۱۶۷۸) نے اسے وسعت دی۔ علمائے طبیعیات کو اشاعت نور کے سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ایک واسطہ کی ضرورت تھی۔ یہ واسطہ ڈے کارٹے کے ایتھر کی صورت میں موجود تھا۔ ضرورت چونکہ غالب تھی۔ اس لئے اس کا محض ایک خیالی ڈھکوسلا ہونا اور متناقض صفات کا مالک ہونا اس کے عارضیتاً تسلیم کئے جانے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کرسکا۔ چنانچہ علم النور میں ایتھر نے نیوٹن کے مکانِ مطلق کی جگہ لی۔ ایتھر کو فرض کرلینے کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایتھر کے واسطہ سے روشنی کس طریقہ سے ہم تک پہنچتی ہے۔ اس کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی منوّر چیز کے ذرّات اپنی حرکت سے ایتھر کے ذرّات میں عملِ ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔ یہ عملِ ارتعاش ایک ذرّہ سے دوسرے ذرّہ پر منتقل ہوتا ہوا ہماری آنکھ تک پہنچتا ہے اور اس میں روشنی کا احساس پیدا کرتا ہے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جو چیز ہم تک پہنچتی ہے وہ ایتھر کے ذرّات نہیں بلکہ انکا عملِ ارتعاش ہے۔ پانی میں پتھر پھینکنے پر تموّج کا جو سلسلہ پیدا ہوتا ہے وہ روشنی کی موجوں سے

کچھ مماثلت رکھتا ہے۔ پانی کی صورت میں بھی جو چیز منتقل ہوتی ہے وہ پانی کے ذرّات نہیں بلکہ فقط ان کی حرکت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پانی کے ذرّات اسی سمت میں مرتعش ہوتے ہیں جو موج کی اشاعت کی سمت ہے۔ برخلاف اس کے ایتھر کے ذرات کی سمتِ ارتعاش روشنی کی موج کی سمت سے زاویہ قائمہ بناتی ہے۔ لیکن ہمارے موجودہ نقطۂ خیال سے اس تمام قصّہ میں جو چیز زیادہ اہم ہے وہ رفتارِ نور کی پیمائش ہے۔ گلیلو نے اوّل اوّل ارضی مبداءِ نور کے ذریعہ سے رفتارِ نور کی پیمائش کی کوشش کی لیکن چونکہ رفتار نور کے مقابلہ میں بڑے سے بڑا فاصلہ بہت کم ہے اور گلیلو کے زمانہ میں وقت کی پیمائش بھی زیادہ صحیح نہ تھی اس لئے تجربہ کچھ قابلِ اعتماد نتیجہ پیدا نہ کر سکا۔ البتہ زمین اور دیگر سیّاروں کے درمیانی فاصلے ایسے بڑے ہیں کہ اس مقصد کے لئے استعمال کئے جا سکتے تھے۔ چنانچہ روئمر (Romier) اور بریڈلے (Bradley) نے ہیات کے واقعات سے مدد لیکر رفتار نور تخمین کی اور اس کی قیمت قریباً تین لاکھ کیلو میٹر فی ثانیہ برآمد ہوئی۔ بعد ازاں جب آلاتِ پیمائش میں بہت کچھ ترقی واقع ہوگئی تو علمائے طبعیات فیزو (Fizeou) اور فوکال Foucalt) تجربہ خانوں میں رفتار نور کی پیمائش کرنے میں کامیاب ہوگئے ان ارضی تجربوں سے بھی وہی قیمت برآمد ہوئی جو ہیات کے واقعات کے ذریعہ سے تخمین کی گئی تھی۔ ان تجربوں کی تفصیل طبعیات کی کسی کتاب میں مل سکتی ہے۔

لیکن یہاں اب ایک دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر روشنی ایتھر میں سے گزرتی ہے اور ایتھر ایک ساکن چیز کی سی نوعیت رکھتا ہے جس میں تمام متحرک نظام جس میں ہماری زمین بھی شامل ہے حرکت کر رہے ہیں تو ایسی صورت میں نظام کی حرکت کا اثر روشنی کی رفتار میں ظاہر ہونا چاہئے۔ مثلاً اگر یہ صحیح ہے کہ ہماری زمین ۳۰ کیلو میٹر فی

ثانیہ کی رفتار کے ساتھ ایتھر میں سے گزر رہی ہے تو اس کی حرکت سے ساکن ایتھر میں اسی طرح حرکت پیدا ہونی چاہئے جس طرح کہ ایک تیز رفتار جہاز کی حرکت سے ساکن ہوا میں حرکتِ اضافی پیدا ہوتی ہے اور اس کا اثر روشنی کی رفتار میں یوں ظاہر ہونا چاہئیے کہ اول زمین کی حرکت کی سمت میں اور پھر مخالف سمت میں رفتارِ نور کی پیمائش کی جائے تو دونوں رفتاروں میں اختلاف ظاہر ہو۔ چنانچہ اس اثر کو معلوم کرنے کے لئے ایسے تجربے کئے گئے جن کے ذریعہ سے اس قسم کا فرق بشرطیکہ وہ موجود ہو نمایاں طور پر ظاہر ہو سکتا تھا۔ سب سے اول ۱۸۸۱ء میں مائکلسن (Michelson) نے ایسا تجربہ کیا اور اس کے بعد ۱۸۸۷ء میں مائکلسن اور مارلے (Morley) دونوں نے مل کر تجربوں کو زیادہ صحت کے ساتھ دُہرایا لیکن ان تجربوں سے وہ فرق جو نمایاں ہونا چاہئیے تھا وہ نہ ہوا۔ لہٰذا اگر تجربہ پر اعتماد کیا جائے تو ایک ساکن اور مطلق ایتھر کے وجود سے انکار لازم آتا ہے ویسے تو ایتھر پہلے ہی سے محض ایک فرضیہ تھا لیکن ان تجربوں کے بعد اس فرضیہ کا وجود بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ لیکن قطع نظر اس کے ان تجربوں سے ایک اور اہم نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ اوپر علم الحیل کے ذکر میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ محض حیلی تجربوں کے ذریعہ سے کسی متحرک نظام کی حرکت ثابت نہیں ہو سکتی۔ اس اصول کو جہاں تک حیلی واقعات کا تعلق تھا ہم نے تسلیم کر لیا تھا اور اسے حیل کے اصولِ اضافیت کا نام دیا تھا۔ اب غور سے دیکھا جائے تو مائکلسن اور مارلے کے تجربے ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ نہ فقط حیلی واقعات بلکہ مناظری واقعات و تجربوں سے بھی کسی متحرک نظام کی حرکت ثابت نہیں ہو سکتی۔ گویا ہم کسی قسم کے طبیعی واقعہ سے یہ استدلال نہیں کر سکتے کہ زیرِ بحث متحرک نظام غیر متغیر رفتار کے ساتھ خطِ مستقیم میں حرکت کر رہا ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک اور واقعہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ طبعیات میں یہ مسئلہ بھی زیر بحث رہا ہے کہ نظری اعتبار سے مبداءِ نور کی حرکت کا اثر روشنی کی رفتار پر پڑنا چاہیے یا نہیں۔ ایک نظریہ کی رُو سے یہ اثر نظری طور پر ثابت ہوتا ہے اور ایک دوسرے نظریہ کی رُو سے نہیں ہوتا۔ لیکن تجربوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مبداءِ نور کی حرکت کا خواہ وہ مبداءِ نور فلکی ہو یا ارضی روشنی کی رفتار پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اس اصول کو اصولِ استقلالِ رفتارِ نور کہا گیا ہے۔

اب ہم آئن شٹائن کی اصل تحقیق کی طرف آتے ہیں۔ آئن شٹائن (۱۹۰۵) نے مذکورۂ بالا دونوں اصولوں کو یعنے اصولِ اضافیت (جس شکل میں کہ ہم اسے پیش کر چکے ہیں) اور اصولِ استقلالِ رفتارِ نور کو بغیر حیل وحجت تسلیم کر لیا اور ان کو فطرت کے اساسی قوانین کی حیثیت میں دوش بدوش کھڑا کر دیا۔ اور اب دیکھا کہ ان دونوں اصولوں کے مان لینے کے بعد کن نتائج کا استنباط کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں ایک سخت دشواری پیش آئی اور وہ یہ تھی کہ ان دونوں اصولوں کو صحیح مان لینے سے ایک قسم کا تناقض لازم آتا ہے۔ جسے ذیل کی مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ فرض کریں کہ ایک ریل گاڑی غیر متغیّر رفتار کے ساتھ ایک مقام پر سے گزر رہی ہے اور اس گاڑی کے اندر تین اشخاص موجود ہیں دو گاڑی کے دونوں سروں پر اور ایک گاڑی کے وسط میں علاوہ ازیں گاڑی سے باہر اس مقام پر جہاں پر سے گاڑی گزر رہی ہے چند اشخاص کچھ فاصلہ پر کھڑے ہیں وہ شخص جو گاڑی کے وسط میں کھڑا ہے ایک وقت معین پر روشنی کا سگنل دیتا ہے اور باہر والے اشخاص اور گاڑی کے اندر والے دوسرے دونوں اشخاص اس روشنی کی رفتار کی پیمائش کرتے ہیں۔ اب اصولِ اضافیت کی رُو سے جہاں تک کہ

ان شاہدوں کے نتائج پیمائش کا تعلق ہے جو گاڑی کے اندر دونوں سروں پر متعین ہیں کوئی اختلاف ظاہر نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن چونکہ گاڑی حرکت کر رہی ہے اس لئے باہر والے شاہدوں کے نتائجِ پیمائش اندر والوں سے مختلف نکلنے چاہئیں۔ اگر گاڑی کی رفتارِ حرکت گ کے برابر ہے تو گاڑی کی حرکت کی سمت میں جو شخص کھڑا ہے اس کی پیمائشِ رفتارِ نور ن۔گ ہونی چاہئے (جہاں ن سے مراد وہ رفتارِ نور ہے جو گاڑی کے اندر والے شاہدوں کی پیمائش کا نتیجہ ہے) اور مخالف سمت والے شاہد کی پیمائش ن + گ ہونی چاہئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی حالت میں پیمائش کے دوران میں گاڑی شاہد کی طرف حرکت کر رہی ہے اور اس سے قریب تر آرہی ہے اور دوسری حالت میں گاڑی شاہد سے پرے ہٹ رہی ہوتی ہے۔ لیکن اصولِ استقلالِ رفتارِ نور اگر صحیح ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ رفتارِ نور کی پیمائش خواہ کسی مقام سے کی جائے ہر صورت میں نتیجہ ایک سا برآمد ہونا چاہئے۔ لہذا اگر ہم اصولِ استقلالِ رفتارِ نور کو صحیح مانیں تو اصولِ اضافیت کو چھوڑ دینا پڑتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ دونوں اصول تجربہ سے اخذ کئے گئے ہیں۔ کسی ایک کو صحیح ماننا یہ معنی رکھتا ہے کہ ہم قاعدہِ استقراء کو صحیح رہبر تسلیم نہیں کر رہے۔ آئن شٹائن نے اس بارہ میں وہی راستہ اختیار کیا جو ایسے شخص کو اختیار کرنا چاہئے تھا جو حکمت جدید کے اصولِ تحقیق پر کہ تجربہ پر مبنی ہے پورا بھروسہ رکھتا ہو۔ تجربہ پر شبہ کرنے کی بجائے اس نے یہ سوال اٹھایا کہ کیا اس ظاہری تناقض کا باعث مکان وزمان کے متعلق ہمارے وہ خیالات نہیں قرار دئے جاسکتے جنھیں ہم نے بدیہی سمجھ کر تسلیم کرلیا ہے۔ اور جو بجنسہ عادت بنکر ہمارے ذہنوں کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم یہ تناقض کسی قسم کے تجربہ کے ذریعہ سے ثابت بھی کرسکتے ہیں یا نہیں؟ ایک تجربہ تو وہ ہوسکتا ہے

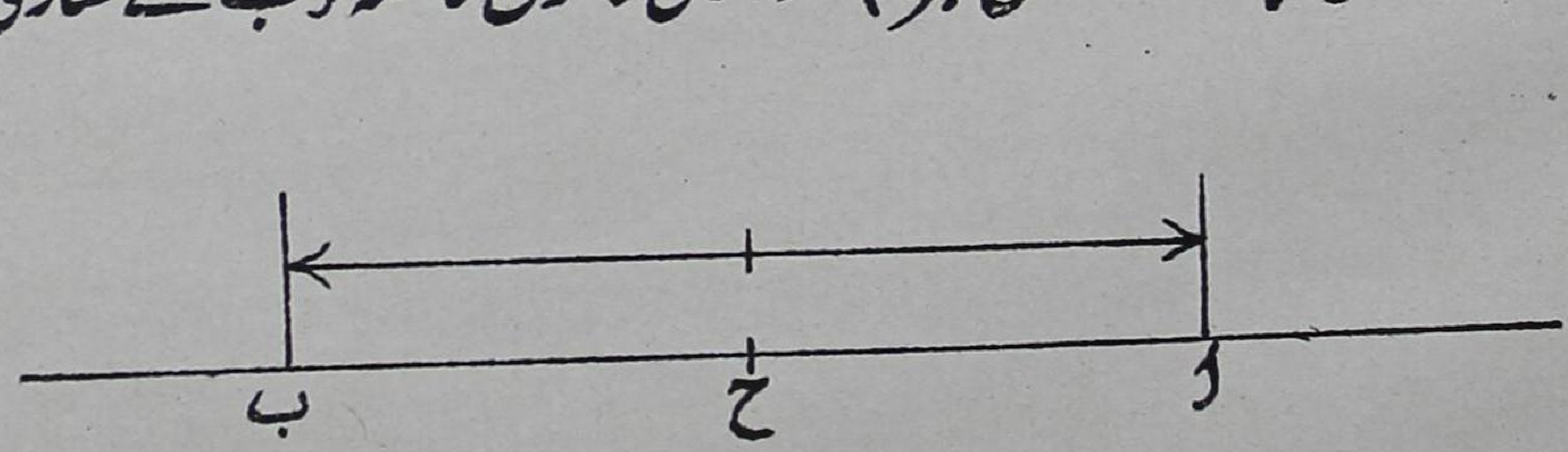
جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اس خیالی تجربہ کو واقعیت کا جامعہ پہنانے میں مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ ہمارے آلاتِ پیمائشِ مکان و زمان ایسے صحیح اور باریک نہیں کہ ہم اس نہایت خفیف سے اختلاف کا جو رفتارِ نور میں واقع ہونا چاہیے تعیّن کر سکیں۔ لیکن آئن شٹائن کہتا ہے کہ اس نا اہلی سے مسئلہ زیر بحث کے حل پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہم فرض کر سکتے ہیں کہ ہمارے پاس اس ضرورت کے مطابق نہایت ہی اعلیٰ آلات مہیّا ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آیا ایسے آلات کے ہوتے ہوئے بھی اس امر کا امکان اصولاً باقی ہے کہ ہم اس تناقض کی تصدیق کر سکیں۔

آئن شٹائن کی رائے میں یہ اصولاً ممکن نہیں۔ اس کو سمجھنے کے لئے ہم اوپر والے تجربہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس تجربہ کے لئے گاڑی کے اندر اور گاڑی کے باہر جو شاہد رفتارِ نور کی پیمائش کے لئے متعین ہیں ان سب کے پاس ایسی گھڑیاں موجود ہونی چاہئیں جو نہ فقط صحیح وقت دیتی ہوں بلکہ جو تجربہ سے پیشتر ایک دوسرے سے ملائی گئی ہے مگر دو گھڑیوں کا ایک دوسرے سے پورے طور پر ملنا کیا معنی رکھتا ہے؟ یہی کہ دونوں گھڑیوں کی سوئیاں ایک وقت معیّن پر ٹھیک ایک مقام پر ہوں اور اس کا امتحان یوں ہو سکتا ہے کہ جب ہم اپنے سامنے میز پر دو گھڑیوں کو رکھیں تو بارہ بجنے پر دونوں گھڑیوں کی سوئیاں ایک وقت پر مقامِ معلومہ پر پہنچیں یا بالفاظ دیگر دونوں واقعات (یعنے ایک گھڑی کی سوئی کا نمبر (۱۲) مقام پر ہونا اور دوسری گھڑی کی سوئی کا بھی مقام نمبر ۱۲ پر ہونا) میں ہم وقتی پائی جاتی ہو۔ اب ظاہر ہے کہ دو ایسے واقعات کا جو ایک دوسرے سے نزدیک واقع ہوں ہم وقت ہونا تو ایک معنی رکھتا ہے۔ جب ہم انہیں ایک ہی وقت میں وقوع پذیر ہوتا دیکھتے رہیں تو اس میں شک کی گنجائش نہیں رہتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دو واقعات کا مختلف مقامات پر ایک وقت میں وقوع پذیر ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟۔ مثال کے طور پر ہم فرض کرتے ہیں کہ

آج اچانک ایک نیا ستارہ آسمان پر چمک اٹھتا ہے (اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں) ظاہر ہے کہ اس نئے ستارے کا دفعتہً روشن ہونا کوئی آج کا واقع نہیں بلکہ واقعۂ گذشتہ ہے جس کی خبر روشنی کے ہرکارہ کے ذریعہ سے ہمیں آج ملتی ہے۔ اب اگر یہ معلوم کرنا چاہئیں کہ نئے ستارے کا روشن ہونا حقیقت میں کب کا واقعہ ہے یا دوسرے لفظوں میں زمین پر کونسا زمانہ اس واقعہ کے ساتھ ہم وقت تھا تو اس کے لئے اوّل ہمیں زمین اور ستارہ کا درمیانی فاصلہ معلوم ہونا چاہئے۔ جب یہ معلوم ہو تو اُسے روشنی کی رفتار سے تقسیم کرنے سے ہمیں وہ زمانہ حاصل ہوگا جو ستارہ سے زمین تک روشنی کے پہنچنے میں صرف ہوا ہے۔ اس زمانہ کو آج کی تاریخ اور وقت سے نفی کرنے سے ہمیں ستارے کے روشن ہونے کا اصلی زمانہ معلوم ہو جائیگا۔ لیکن غور سے دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس ہم وقتی کے تعین کرنے میں ہم نے اصولِ استقلالِ رفتارِ نور سے کام لیا ہے کیونکہ ہم نے اس بات کا بالکل لحاظ نہیں کیا کہ آیا اس دوران میں یعنے ستارہ سے زمین تک روشنی پہنچنے میں ستارہ اور زمین بھی حرکت کرتے ہیں یا نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اصولِ استقلالِ رفتارِ نور کی رُو سے اس حرکت کا رفتارِ نور پر مطلق کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس اصول کو تسلیم کئے بغیر کیا ہم وقتی کا تعیّن کیا جا سکتا ہے۔ فرض کریں کہ اصول استقلالِ رفتارِ نور صحیح نہیں اور ہماری زمین اور ستارہ مشترک طور پر خطِ مستقیم میں حرکت کر رہے ہیں تو روشنی کی رفتار حرکت کی دونوں سمتوں میں مختلف ہوگی۔ لہذا ستارہ کے روشن ہونے کا زمانہ اور تاریخ دونوں صورتوں میں مختلف ہونی چاہئے لیکن اصول اضافیت یہ بتاتا ہے کہ ستارہ اور زمین کی یہ مشترکہ حرکت ہی سرے سے ثابت نہیں۔ تو ہم وقتی کی صحت کے متعلق فیصلہ کرنے کا معیار ہمارے پاس کیا رہا! ۔ الغرض ہم وقتی کا تعیّن

اصولِ استقلالِ رفتارِ نور کو تسلیم کیے اور اس سے مدد لیے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اب غور کرنا چاہیے کہ اصولِ استقلالِ رفتارِ نور کو باطل ٹھیرانے سے جو تجربہ ہم کرنے والے ہیں اس میں ایسی گھڑیوں کی ضرورت پڑتی ہے جو ہم وقتی کے اصول پر ایک دوسرے سے ملائی گئی ہوں اور ہم وقتی کے تعین کے لئے ہم اصولِ استقلالِ رفتارِ نور سے مدد لے رہے ہیں تو گویا ہم ایک اصول کو ایسے ذرائع سے باطل ٹھیرانے کی کوشش کر رہے ہیں جن ذریعوں کے مہیا کرنے میں اُسی اصول سے مدد لے چکے ہیں۔ آئن شٹائن کے قیاس میں اور ظاہر ہے کہ ہر صاحب فہم و فراست کے خیال میں اس کوشش یا تجربے کا کامیاب ہونا ممکن نہیں۔ غرضیکہ آئن شٹائن اس کے سوا چارہ نہیں پاتا کہ دونوں اصولوں کو صحیح تسلیم کر لے اور مکان و زمان کے تصورات کی اس طرح ترمیم کرے کہ دو یا زیادہ اضافی طور پر حرکت کرنے والے نظاموں میں رفتارِ نور کی پیمائش میں کوئی فرق پیدا نہ ہو۔

ذیل کی مثال[۱] مکان و زمان کے ان ترمیم شدہ تصورات کے سمجھنے میں مدد دے سکتی ہے۔ فرض کریں کہ ایک ریل گاڑی غیر متغیر رفتار کے ساتھ ایک پلیٹ فارم ا ب کے پاس سے گزرتی ہے (دیکھو شکل نمبر ۱) اور گاڑی کا طول فاصلہ ا ب کے مساوی ہے



شکل نمبر (۱)

۱؎ یہ مثال Hans Thirring کی کتاب Relativitatstheorle .... Die Idee der سے لی گئی ہے

گاڑی کے اندر عین وسط میں ایک شاہد کھڑا ہے اور ایسے ہی پلیٹ فارم پر ا ب کے عین وسط یعنی نقطہ ج پر ایک اور شاہد کھڑا ہے۔ مزید براں یہ فرض کر لیا جائے کہ پلیٹ فارم کے اوپر نقطہ ا و ب پر دو ایسی بجلی کی بتیاں موجود ہیں کہ جب گاڑی کے شروع کا حصہ ا پر اور آخری حصہ مقام ب پر پہنچتا ہے تو یہ دونوں بتیاں خود بخود روشن ہو جاتی ہیں اب سوال یہ ہے کہ کیا بتیوں کا روشن ہونا دونوں شاہدوں کے لئے ہم وقت واقعات کی حیثیت رکھتے ہیں ظاہر ہے کہ پلیٹ فارم والا شاہد چونکہ ا اور ب کے عین وسط میں کھڑا ہے اس لئے وہ دونوں بتیوں کو ایک ہی وقت پر روشن ہوتا دیکھیگا لیکن گاڑی کے وسط میں جو شاہد کھڑا ہے وہ اس تھوڑے سے وقت میں کچھ اور ا کی جانب بڑھ گیا ہے اس لئے ا سے آنیوالی روشنی کی شعاعیں اُس تک ب سے آنے والی شعاعوں سے پہلے پہنچینگی۔ لہٰذا وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہوگا کہ دونوں بتیوں کا روشن ہونا اس کے لئے ہم وقت واقعات نہیں ہیں۔ اس جگہ یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ گاڑی کے اندر جو شاہد ہے وہ مشاہدہ کرتے وقت ا ب کے عین وسط میں نہیں رہا اس لئے اس کی رائے قابل اعتبار نہیں کیونکہ ہم وقتی کی تعریف کے لحاظ سے دو واقعات اس وقت ہم وقت کہے جا سکتے ہیں جبکہ ایک ایسا شخص جو ٹھیک ان دونوں کے وسط میں موجود ہو انھیں ایک ہی وقت میں وقوع پذیر ہوتا دیکھے۔ رفعِ اعتراض کے لئے ہم فرض کرتے ہیں کہ گاڑی کے دونوں سروں کے ساتھ ہی دو بتیاں لگی ہوئی ہیں جو ٹھیک اس وقت روشن ہوتی ہیں جب دونوں سرے ا اور ب پر پہنچتے ہیں۔ اس صورت میں گاڑی کے وسط میں جو شاہد موجود ہے وہ ہر حالت میں دونوں بتیوں کے وسط میں رہتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے حرکت کی وجہ سے وہ آگے کی

بتّی کو پیچھے کی بتّی سے پیشتر روشن ہوتا دیکھیگا قصہ کوتاہ ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ دو واقعات جو ایک غیر متحرّک شاہد کے نقطۂ نظر سے ایک ہی وقت وقوع پذیر ہوتے ہیں وہی واقعات ایک متحرّک شاہد کی نظر میں ایک ہی وقت میں وقوع پذیر نہیں ہوتے بلکہ آگے اور پیچھے اور چونکہ اصولِ اضافیت کی رُو سے طبیعی واقعات کا لحاظ کرتے ہوئے ایک متحرّک نظام ایک غیر متحرّک نظام کے مساوی ہے اس لئے اس نتیجہ کا برعکس بھی صحیح ہونا چاہئے۔ یعنے جو واقعات ایک متحرّک شاہد کیلئے ایک ہی وقت میں ظہور پذیر ہوتے ہیں وہی ایک غیر متحرّک شاہد کے لئے مختلف وقتوں میں ظاہر ہوتے ہیں، گویا پیمائش زمانہ ایک اضافی حیثیت رکھتا ہے یعنے کسی واقعہ میں جو وقت صرف ہوتا ہے اس کا اندازہ کرنے والے کی حالتِ حرکت پر موقوف ہے مثلاً زمین پر کوئی واقعہ رُونما ہوتا ہے اور اس واقعہ کے رُونما ہونے میں جو وقت صرف ہوتا ہے اس کی پیمائش ایک طرف اہل زمین کی طرف سے عمل میں آتی ہے اور دوسری جانب ایک ایسے نظام کے ساکنوں کی طرف سے عمل میں آتی ہے جو زمین کے مقابلہ میں اضافی طور پر حرکت کر رہا ہوتا ہے۔ (آفتاب ایک ایسا نظام ہو سکتا ہے)۔ تو مندرجہ بالا استدلال کی بنا پر اہلِ آفتاب کی پیمائش اہلِ زمین کی پیمائش سے کم ہوگی۔ اسی طرح پیمائش طول بھی محض ایک اضافی چیز ہے۔ فرض کریں کہ اوپر کی مثال میں ہمارے دونوں شاہد گاڑی کے طول کی پیمائش کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ پلیٹ فارم والا شاہد فاصلہ ا ب کی پیمائش کرتا ہے اور اُسے ۱۰۰ گز پاتا ہے۔ اس کے نزدیک یہی گاڑی کا طول ہے کیونکہ جب گاڑی کا اگلا سرا ا پر پہنچتا ہے تو اسی وقت پچھلا سرا ب پر ہوتا ہے لیکن گاڑی کے اندر والا شاہد مقام ا کی بتی کو مقام ب کی بتّی سے پیشتر روشن ہوتا دیکھتا ہے۔ وہ اُس سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اس کی گاڑی نقطہ ا پر پہلے پہنچ چکی ہے اور ب پر بعد کو پہنچتی ہے۔ لہٰذا اس کے

نزدیک گاڑی کا طول سو گز سے کچھ زیادہ ہوگا۔ گویا ایک غیر متحرک شاہد کو متحرک چیزیں طول میں حرکت کی سمت میں چھوٹی نظر آئینگی۔ اور علیٰ ہذالقیاس اصولِ اضافیت کی رُو سے ایک متحرک شاہد کو ساکن اجسام طول میں کم نظر آئیں گے۔ فرض کریں کہ زمین پر ایک ساکن شاہد اپنی چھڑی کا طول ناپتا ہے اور اسے ایک گز کے برابر پاتا ہے۔ اب اگر اسی چھڑی کے طول کی پیمائش ایک ایسے شاہد سے عمل میں آئے جو آفتاب پر موجود ہو تو کیا پیمائش میں کوئی فرق پیدا ہوگا؟ مندرجہ بالا نتائج کی رُو سے آفتاب اور زمین یعنی آفتاب اور چھڑی میں چونکہ اضافی حرکت کا وجود پایا جاتا ہے اس لئے آفتاب پر سے جو پیمائش کی جائیگی اس کے حساب سے چھڑی کا طول ایک گز سے کچھ کم برآمد ہوگا۔

ان نتائج کے علاوہ نظریہ اضافیت سے چند اور اہم نتائج بھی اخذ کئے گئے ہیں جنکے متعلق خود آئن سٹائن کی یہ رائے ہے کہ انھیں نظریہ اضافیتِ خاص کے اہم ترین نتائج قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان نتائج کو عام فہم الفاظ میں یوں ادا کیا جاسکتا ہے جب مکان و زمان کے متعلق مذکورہ بالا خیالات کو پیش نظر رکھ کر حیلی واقعات پر نظر ڈالی جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اب انھیں واقعات پر اصولِ اضافیت کا اطلاق نہیں ہوتا۔ لیکن چونکہ اصولِ اضافیت ایک مسلمہ اصولِ فطرت ہے اس لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ نیوٹن کے علم الحیل کے دامن کو چھوڑ دیا جائے اور میکانک میں ایسا تغیر کیا جائے کہ حیلی واقعات پر اصول اضافیت کا اطلاق ہوسکے۔ چنانچہ آئن سٹائن نے ایسا ہی کیا اور اس تغیر کی تفصیل یوں ہے کہ پرانے علم الحیل کے مطابق کسی جسم میں اسراع پیدا کرنے کے لئے متناسب قوت کی ضرورت ہوتی ہے یعنے اگر کوئی جسم دس کیلو میٹر فی ثانیہ کی رفتار سے حرکت کر رہا ہو اور اس حرکت کے لئے ایک معین قوت درکار ہو تو اس جسم کو دس کیلو میٹر فی ثانیہ

کی رفتار سے بیس کیلومیٹر فی ثانیہ کی رفتارِ حرکت پر لانے کے لئے پہلے سے دوگنی قوت درکار ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر قوت اور اسراع کا حاصل تقسیم ہمیشہ مستقل ہوتا ہے۔ اس مستقل کو طبعیات کی اصطلاح میں اس جسم کی کمیّت جمود کہتے ہیں گویا نیوٹن کی میکانک کے اعتبار سے کسی جسم کی کمیّت جمود پر اس جسم کی بڑھتی ہوئی رفتارِ حرکت کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ لیکن نظریۂ اضافیت کی پیدا کردہ میکانک کی رُو سے کمیّتِ جمود پر رفتار حرکت کا اثر پڑتا ہے۔

اس کو یوں سمجھنا چاہیے۔ فرض کیجئے ایک متحرک جسم دس کیلومیٹر فی ثانیہ کی رفتار کے ساتھ حرکت کر رہا ہے۔ اسی جسم کی رفتار میں دس کیلومیٹر فی ثانیہ کا اضافہ کرنے کے لئے ایک معیّن قوّت کی ضرورت ہوتی ہے جسے ہم لا کے برابر رکھ سکتے ہیں۔ اب ہم فرض کرتے ہیں کہ وہی جسم ١٠ کیلومیٹر فی ثانیہ کی بجائے ابتدا میں ١٠٠٠ کیلومیٹر فی ثانیہ کی رفتار سے حرکت کر رہا ہے اور ہم اس کی رفتار حرکت میں دس کیلومیٹر فی ثانیہ کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو کیا وہ قوت جو ہم اس مرتبہ خرچ کریں گے قیمت میں اُسی لا کے برابر ہوگی؟

نیوٹن کی میکانک تو اس سوال کا جواب اثبات میں دیتی ہے لیکن آئن شٹائن کی نئی میکانک کے اعتبار سے دوسری صورت میں پہلے کی بہ نسبت زیادہ قوت صرف ہوگی۔ گویا جسم کی کمیت جمود میں رفتارِ حرکت کے اضافہ سے بیشی واقع ہوتی جائے گی۔ یہانتک کہ جب کسی جسم کی رفتار حرکت رفتارِ نور کے برابر ہوجائیگی تو اس جسم کی کمیّت جمود لاانتہا ہوگی۔ لیکن معمولی رفتاروں کی صورت میں جو رفتارِ نور کے مقابلہ میں بہت کم ہیں آئن شٹائن کے تخمینہ کے مطابق جو اضافہ کمیّت میں واقعہ ہونا چاہیے وہ اس قدر حقیر ہے کہ ہم بہترین آلات کے ذریعہ سے بھی تعیّن نہیں کرسکتے۔ البتہ ریڈیم کی تحلیل کے دوران میں ایک خاص قسم کی شعاعیں نکلتی ہیں جو ب شعاعیں کہلاتی ہیں اور جو برق

پاروں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان برق پاروں کی رفتارِ حرکت غیر معمولی طور پر بہت زیادہ ہے اور رفتارِ نور کے قریب قریب پہنچتی ہے۔ ان کے متعلق جو تجربے کئے گئے ہیں وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ترقیِ رفتار سے کمیت میں فی الواقعہ اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کمیّتِ مادہ بھی محض اضافی حیثیت رکھتی ہے۔

علاوہ ازیں نظری طور پر یہ ثابت ہے کہ رفتار حرکت کی ترقی سے کمیّت میں جو اضافہ واقع ہوتا ہے وہ اس متحرک جسم کی توانائی بالفعل کے متناسب ہے۔ اور چونکہ توانائی بالفعل توانائی کی ایک شکل ہے جو دوسرے اشکالِ توانائی مثلاً حرارت برقی توانائی کیمیائی توانائی وغیرہ میں تبدیل ہوسکتی ہے اس لئے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ مادہ میں کسی شکل کی توانائی داخل کر دینے سے اُس مادّہ کی کمیت میں اضافہ ہونا چاہئے۔ گویا توانائی مادّہ کی صورت اختیار کرسکتی ہے۔ آئن شٹائن اس پر بھی اکتفا نہیں کرتا بلکہ یہ کہتا ہے کہ جو مادّہ کسی متحرک یا ساکن جسم میں پہلے سے موجود ہے وہ بھی اس جسم کی توانائی بالفعل یا اس کے ذرّات کی توانائی کی ایک دوسری شکل ہے۔ اس کے نزدیک جس چیز کو ہم مادّہ کہتے ہیں وہ دراصل توانائی ہے جس نے مرتکز ہوکر یہ صورت اختیار کی ہے۔ ثانویت سے وحدت کی طرف سائنس کا یہ رخ فلسفیانہ نقطہ خیال سے ایک گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ ابتدا سے فلسفہ میں دو بڑے گروہ یا اسکول رہے ہیں۔ ایک تو ثانویت کا قائل رہا ہے۔ اور دوسرا وحدت کا۔ اقبل الذکر کے نزدیک مادہ اور رُوح دو بالکل مختلف الاصل چیزیں ہیں۔ موخرالذکر کے نزدیک یہ دونوں متحد الاصل ہیں اور ایک ہی اصل حقیقت کے پرتو ہیں۔ لیکن آگے چلکر یہ گروہ دو گروہوں میں منقسم ہوجاتا ہے۔ یعنی مادّہ پرست اور تصوّریہ۔ مادّہ پرست کے نزدیک اصل حقیقت مادہ ہے اور روح اسی کی پیدا کردہ چیز ہے۔ تصوّریہ اس کے برعکس روح کو اصلِ حقیقت

گردان کر مادّہ کو اُس کا ایک مظہر تصوّر کرتے ہیں۔ ان دونوں کے علاوہ ایک گروہ ایسا بھی ہے جو مادّہ اور رُوح دونوں کو اصل حقیقت نہیں مانتے بلکہ ان دونوں کی تہ میں ایک تیسری چیز کو ڈھونڈتے ہیں جو ان دونوں کی اصل ہے۔ گذشتہ دو صدیوں میں سائنس میں جو حیرت انگیز ترقی واقع ہوئی اور دُنیائے مادّہ کے سربستہ راز یکے بعد دیگرے منکشف ہوکر چشمِ دنیا کو خیرہ کرنے لگے تو یہ گمان غالب تھا کہ مادّیت کا فلسفہ زور پکڑ جائیگا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ معروف فلسفیوں میں سے بہت کم ایسے ملینگے جو صحیح معنوں میں مادّیت کے قائل ہوئے ہوں البتہ لاادریت کا فلسفہ خوب چمکا اور اگرچہ اس کے مخالفین نے لاادریت کو مادہ پرستی کہکے اُسے بدنام کرنے کی بہت کوشش کی مگر حقیقت یہ ہے کہ لاادریت۔ مادّہ پرستی سے اسیقدر بعد رکھتا ہے جسقدر کہ تصوّریت سے + (یہ ایک جملہ معترضہ تھا) اب مندرجہ بالا نتائج سے نہ فقط حقیقت کا واحد الاصل ہونا ظاہر ہوتا ہے بلکہ یہ بھی منکشف ہوتا ہے کہ اصل چیز توانائی ہے نہ کہ مادّہ۔ اس تحقیق سے مادّیت کی پوزیشن کمزور تر ہوگئی ہے۔

بقیہ مضمون بصفحہ آئندہ

دوسرا حصّہ

نظریۂ اضافیت عام

نظریۂ اضافیت خاص کے متعلق جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے اس سے یہ امر واضح ہو جانا چاہئے کہ یہ نظریہ دو بنیادی اصولوں پر قائم ہے جن میں سے ایک اصول اصولِ اضافیت اور دوسرا اصولِ استقلالِ رفتارِ نور کہلاتا ہے۔ نیز یہ امر بھی ذہن نشین ہو جانا چاہیے کہ اول الذکر اصول ایک خاص قسم کی حرکت کی اضافیت سے بحث کرتا ہے یعنی خطِ مستقیم میں غیر متغیّر حرکت۔ ان دونوں اصولوں کو تسلیم کر لینے کے بعد ان تمام نتائج کو باوجود ان کی انقلاب انگیز نوعیت کے ماننا پڑتا ہے جو بوسیلۂ منطق ریاضی ان اصولوں سے مستنبط ہیں۔ نظریہ اضافیتِ خاص کا ایک بڑا کارنامہ نیوٹن کے مکانِ مطلق کی تکذیب ہے جہاںتک خطِ مستقیم میں غیر متغیّر حرکت کا تعلق ہے۔ نظریہ اضافیت کا فیصلہ یہ ہے کہ اس قسم کی حرکت مطلق معنوں میں ناقابلِ تصدیق ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حرکت مطلق کا ناقابل ثبوت ہونا فقط مذکورہ بالا حرکت تک محدود ہے یا ہر قسم کی حرکت کے متعلق صحیح ہو سکتا ہے۔ حرکت کی ایک قسم اسراعی حرکت بھی ہے یعنے وہ حرکت جس کی رفتار غیر متغیّر نہیں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس اسراعی حرکت کا ثبوت گرد و پیش کو مشاہدہ میں لائے بغیر مل سکتا ہے، کیونکہ اس قسم کی حرکت میں جمودی قوتوں کا نشوونما واقع ہوتا

ہے۔ مثلاً اگر ایک غیر متغیّر رفتار کے ساتھ حرکت کرنے والی ریل گاڑی کی رفتار میں دفعتہً اضافہ یا کمی کردی جائے تو مسافروں کو اس اسراع کا علم گرد وپیش کے مشاہدہ کے بغیر حاصل ہوجانا چاہئیے۔ بعض اوقات مثلاً دو گاڑیوں کے ٹکرانے پر یہ علم کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہوتا۔ اس سے حرکتِ مطلق ثابت ہوتی ہے۔ جس کے یہ معنے ہیں کہ نیوٹن کے مکانِ مطلق کا وجود باوجود نظریۂ اضافیت کی کوششوں کے باقی ہے۔ صورتِ حال یہ پیدا ہوتی ہے کہ ایک طرف تو غیر متغیّر حرکت کا ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن دوسری طرف حرکت کی اسراع کا ثبوت مہیّا ہوسکتا ہے۔

آئن شٹائن کا فلسفیانہ دماغ اس بے ربطی کا متحمّل نہیں ہوسکتا تھا۔ نیوٹن کی میکانک اس مسلّمہ پر قائم تھی کہ کسی جسم کا جمود اس جسم کا ذاتی خاصّہ ہے جو دوسرے اجسام کی موجودگی سے مستغنی ہے۔ مگر کیا یہ زیادہ قرین قیاس نہیں ہے کہ جس طرح کسی جسم کا وزن دوسرے اجسام کی موجودگی پر موقوف ہے اسی طرح اس کا جمود بھی دوسرے اجسام کی موجودگی سے وابستہ ہے۔ اگر جمود کے متعلق یہ دوسرا خیال تسلیم کرلیا جائے تو اصولِ اضافیت کو ہر نوعِ حرکت پر عائد کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ لیکن ظاہر ہے کہ تجربہ و مشاہدہ سے اس امر کا فیصلہ کیا جانا ناممکن ہے کہ جمود کے متعلق ان دونوں فرضیوں میں سے کونسا صحیح ہے۔ یہ فیصلہ اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ تمام اجسام کائنات کو فنا کردیا جائے اور صرف ایک متحرک نظام باقی رہے۔ یہاں آئن شٹائن کے حکیمانہ کمال کا معترف ہونا پڑتا ہے کہ اس نے کس طرح ایک دوسرے معروف تجربی واقعہ سے مدد لیکر اس امر کا ثبوت بہم پہنچایا کہ اس کا فرضیہ نیوٹن کے فرضیہ کی بہ نسبت زیادہ قرینِ قیاس مانا جاسکتا ہے۔ اس مضمون کے ابتدا میں جہاں حرکت کے کلیۂ اول کا ذکر تھا وہاں یہ بھی اشارہ کیا گیا تھا کہ کمیّتِ جمود اور وزن کا

متناسب ہونا نہایت گہری اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اہمیت دو سو سال تک علمائے طبیعیات پر پوشیدہ رہی جب آئن سٹائن کو ۱۹۰۷ء میں مندرجہ بالا دشواریوں کا سامنا ہوا اور اُسے اپنے فرضیہ کے استحکام کے لئے واقعات کی تلاش ہوئی تو اس کی محققانہ نگاہ کو اسی واقعہ میں اپنی رائے کی زبردست تائید نظر پڑی۔ آئن سٹائن کے نزدیک کمیّتِ جمود اور وزن کا تناسب یہ معنی رکھتا ہے کہ جس طرح وزن ایک اضافی چیز ہے اس طرح جمود بھی اضافی حیثیت رکھتا ہے اور دوسرے اجسام کی موجودگی پر موقوف ہے۔ بنابریں جمودی قوتوں کے نشوونما سے کوئی شخص قطعی طور پر اسراعِ حرکت پر اور اسراعِ حرکت سے مکانِ مطلق پر استدلال نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ مشتبہ ہو سکتا ہے کہ جمودی قوتوں کو وجود میں لانے والی چیز اسراعِ حرکت نہیں بلکہ تجاذب ہے۔ گویا جمود اور تجاذب مادہ کے ناقابلِ تفریق و امتیاز خواص ہیں اور چونکہ ان میں ایک مستقل رشتہ پایا جاتا ہے اس لئے ایک دوسرے کی جگہ لے سکتا ہے، لہذا آئن سٹائن کا دعویٰ یہ ہے کہ طبیعی واقعات کے اعتبار سے میدانِ قوت[1] جمود جو خطِ مستقیم میں اسراعی حرکت سے پیدا ہوتا ہے میدانِ قوتِ تجاذب کے جو مادّہ کی موجودگی سے پیدا ہوتا ہے مساوی ہے۔ یعنے ان دونوں میدانوں میں طبیعی واقعات ایک ہی طرح ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اس دعویٰ کو آئن سٹائن نے دعوئے مساویت کا نام دیا ہے اور اس سے اگر ایک طرف اصول اضافیت کی توسیع میں کام لیا ہے تو دوسری جانب ایک نئے نظریۂ تجاذب کی بنیاد استوار کرنے میں مدد حاصل کی ہے۔ ذیل کی مثال سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آجائیگی کہ کس طرح دعویِ مساوات کے ذریعہ سے نیوٹن کی اسراعِ مطلق کی تکذیب کی جا سکتی ہے۔

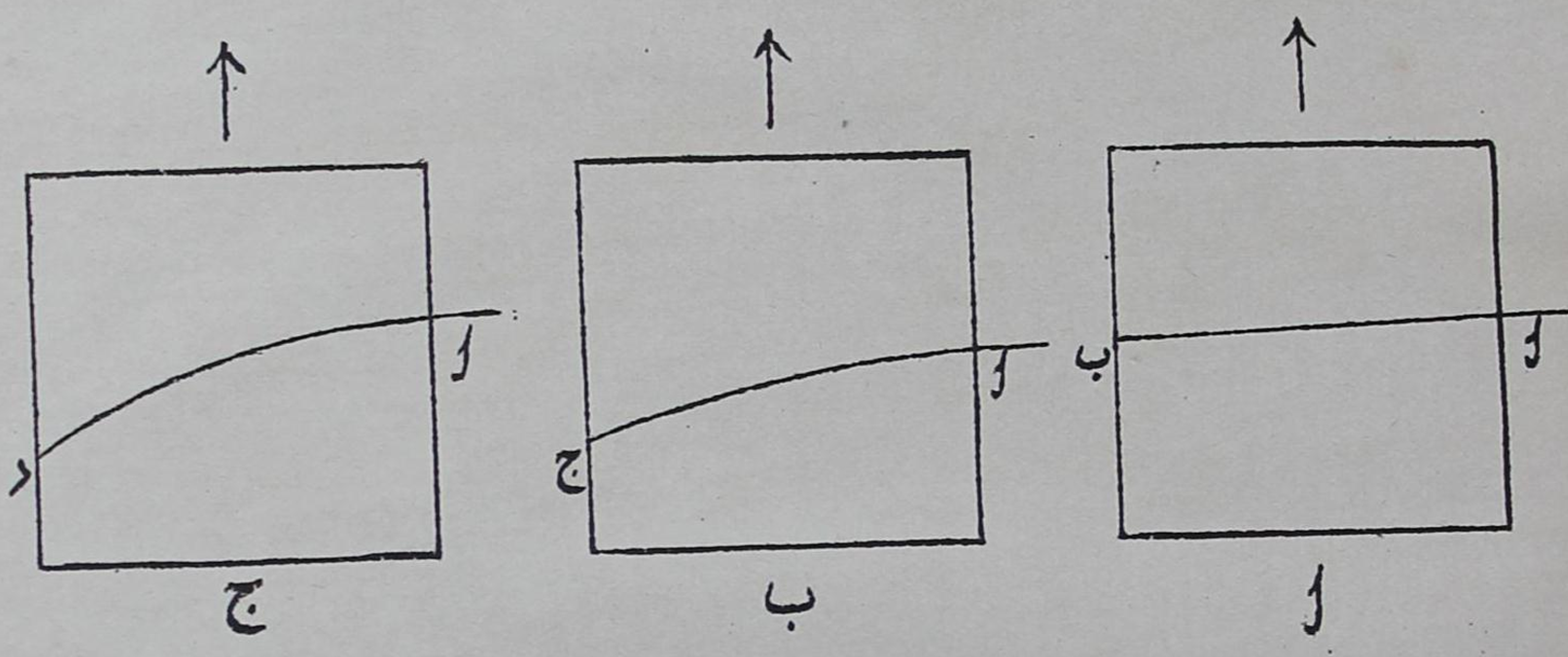
---

(۱) کسی قوّت کے میدان سے مراد اس کا حلقۂ عمل ہے یعنے وہ تمام علاقہ جہاں اس قوّت کا اثر پہنچتا ہے۔

ہم ایک بڑا صندوق فرض کرتے ہیں جو ہر طرف سے بند ہے اور جس کے اندر دو اشخاص معہ آلاتِ میکانک موجود ہیں۔ یہ صندوق فضا میں اوپر کی جانب حرکت کر رہا ہے۔ اب اگر اس صندوق کی رفتارِ حرکت میں اضافہ پیدا ہو تو دیکھنا یہ ہے کہ اس تغیّر کا اثر حیلی واقعات پر کیا ہوتا ہے اور دونوں اشخاص اس اثر کی علت کے متعلق کیا استدلال کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جیسے صندوق کی رفتارِ حرکت میں اضافہ ہوگا اہلِ صندوق پہلے کی نسبت اپنے پاؤں پر زیادہ دباؤ محسوس کرینگے۔ اگر وہ کسی چیز کو صندوق میں گرائینگے تو اسے زیادہ سُرعت کے ساتھ گرتی پائینگے۔ اگر ان کے پاس کمانی دار ترازو موجود ہے تو اضافۂ رفتار سے ترازو کی کمانی کا تناؤ بڑھ جائیگا وغیرہ وغیرہ۔ اب ان مشاہدات کی بنا پر دونوں اہلِ صندوق میں سے کوئی ایک یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ صندوق کی رفتارِ حرکت میں اسراع واقع ہوا ہے۔ لیکن اگر دوسرا شاہد اس نتیجہ میں شُبہ کرے تو وہ بھی راستی پر ہے کیونکہ وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ صندوق کی رفتارِ حرکت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا بلکہ جاذبہ میں اضافہ واقع ہوا ہے۔ گویا بعینہٖ جس طرح نظریۂ اضافیت خاص کے ذکر میں غیر متغیر حرکت کے وجود پر شبہ ہوا تھا اسی طرح اسراعی حرکت کے وجود پر بھی شبہ ہو سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر اسراعی حرکت بھی اضافی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نتیجہ کی بناء پر نظریہ اضافیت کے اس حصہ کو نظریۂ اضافیت عام کا نام دیا گیا ہے۔

لیکن ابھی اصول اضافیت کے اطلاق کی تکمیل میں کسر باقی ہے۔ اوپر والی مثال میں جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے وہ محض حیلی تجربوں اور واقعات کی بناء پر کیا گیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اور دوسرے طبیعی واقعات مثلاً مناظری وغیرہ کی مدد سے اسراعی حرکت کے وجود پر استدلال نہیں کیا جا سکتا؟ غیر متغیر حرکت کی صورت میں تو اس سوال کا جواب

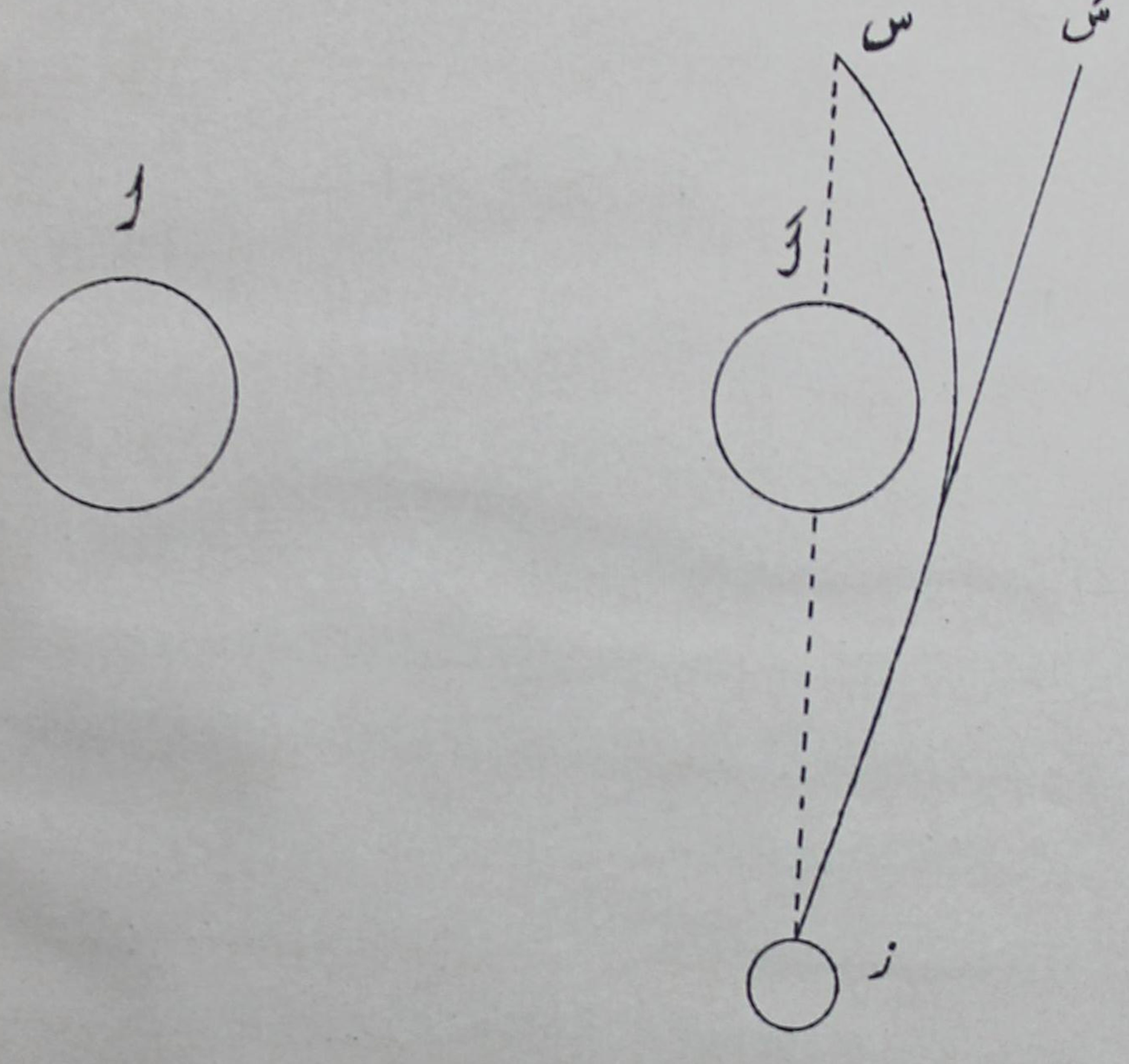
مائکلسن اور مارلے کے مشہور تجربہ کی بنیاد پر نفی میں موجود تھا۔ لیکن اسراعی حرکت کے متعلق آئن سٹائن کے سامنے اپنا نظریہ اضافیتِ عام پیش کرتے وقت کوئی ایسا تجربہ موجود نہ تھا جو یہ ثابت کرتا ہو کہ غیر حیلی واقعات سے بھی اسراعی حرکت کا وجود ثابت نہیں ہو سکتا آئن سٹائن نے محض اس خیال سے کہ عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ اصولِ اضافیت جیسا زبردست قانونِ فطرت حیلی واقعات کے اعتبار سے تو صحیح ہو لیکن دیگر طبیعی واقعات پر عائد نہ ہو سکے اپنے دعویٰ میں تمام طبیعی واقعات کو شامل کرنے کی جرأت کی اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اپنے دعویٰ کو یوں پیش کیا کہ قوتِ جمود اور قوتِ تجاذب دونوں کے میدانِ عمل میں تمام طبیعی واقعات یکساں ظہور پذیر ہوتے ہیں یعنے ہم کسی قسم کے طبیعی واقعہ سے اسراعی حرکت کے وجودِ مطلق پر استدلال نہیں کر سکتے کیونکہ وہی واقعات بعینہٖ میدانِ قوت تجاذب کے عمل سے منسوب کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ دعویٰ محض قیاس اور احتمال کی منزل سے آگے بڑھنے نہ پاتا اگر ایک حیرت انگیز طریق سے بذریعۂ تجربہ مشاہدہ اس کی تصدیق نہ ہو جاتی جیسا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہوئی۔ اس کی تفصیل ذیل کی مثال سے واضح ہو گی۔ فرض کریں کہ ایک صندوق غیر متغیر رفتار کے ساتھ فضا میں اوپر کی طرف حرکت کر رہا ہے اور روشنی کی ایک شعاع جو فضا میں افقی سمت میں گزر رہی ہوتی ہے ایک سوراخ ا کے ذریعہ سے صندوق کے اندر پہنچتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر صندوق متحرک نہ ہوتا تو وہی شعاع صندوق کے اندر مقابل دیوار پر نقطہ ب پر جو ا کے عین مقابل ہے پڑتی (دیکھو شکل نمبر ۲ ا) لیکن صندوق حرکت کر رہا ہے۔ اس لئے وہی شعاع نقطہ ب کی بجائے نقطہ ج پر ہو گی (دیکھو شکل نمبر ۲ ب) کیونکہ اس تھوڑے سے وقت میں جو روشنی کو ا سے ب تک پہنچنے میں صرف ہوتا ہے صندوق کچھ اوپر کی جانب حرکت کرتا ہے۔ لہٰذا اہل صندوق کو روشنی



شکل نمبر(۲)

کی شعاع ٹیڑھی دکھائی دیگی اور ٹیڑھاپن اسی قدر زیادہ ہوگا جسقدر کہ صندوق کی رفتار حرکت زیادہ ہوگی۔ اب اگر صندوق غیر متغیر حرکت کی بجائے اسراعی حرکت میں گرفتار ہے تو چونکہ اس کی رفتارِ حرکت آخری لمحوں میں ابتدائی لمحوں کی نسبت زیادہ ہے اس لیئے روشنی کی شعاع کا ٹیڑھاپن شروع کی نسبت آخر میں زیادہ ہونا چاہیئے یعنے شعاع کو ایک خطِ منحنی پیدا کرنا چاہیئے (دیکھو شکل نمبر ج) مزید براں چونکہ دعویٔ مساویت کی رُو سے قوّت جمود کا میدانِ عمل ہر لحاظ سے قوتِ تجاذب کے میدانِ عمل کے مساوی ہے۔ لہٰذا قوّتِ تجاذب کے میدانِ عمل کے اندر سے گزرنے والی روشنی کی شعاع کے خط میں بھی انحنا کا واقع ہونا لازمی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کائنات میں ایسا کونسا میدانِ تجاذب ہے جس کے اندر سے گزرنے والی روشنی کی شعاع کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، آفتاب پر نظر پڑتی ہے کیونکہ اس کا بڑا جسم قوتِ تجاذب کی زیادتی کی دلیل ہے۔ فرض کریں کہ ا اور اَ سے آفتاب کے دو مختلف مقامات مراد ہیں (دیکھو شکل نمبر ۳) س ایک ستارہ اور ز زمین پر ایک شاہد ہے۔ جس حالت میں کہ آفتاب مقام ا پر یعنے ستارے اور زمین کے ملانے والے خط سے

بہت پرے ہے اسوقت ستارے کی روشنی خطِ مستقیم میں زمین والے شاہد تک پہنچے گی



شکل نمبر(۳)

کیونکہ آفتاب کی قوتِ تجاذب کا میدانِ عمل روشنی کی شعاعوں تک نہیں پہنچتا۔لیکن اگر آفتاب مقام اؔ پر ہو تو اسوقت مندرجہ بالا استدلال کی بنا پر ستارہ سے آتی ہوئی روشنی کی شعاعیں آفتاب کے تجاذب کے زیر اثر انحناپذیر ہو کر زمین تک پہنچینگی۔لہذا اس دوسری

صورت میں زمین والا شاہد ستارے کو بجائے س کے مقام سؔ پر دیکھیگا۔ آئن شٹائن کی اس عجیب وغریب پیشین گوئی کا امتحان علمی طور پر اس طرح کیا جانا ممکن تھا کہ س کے مقام کا تعین عکسالہ کے ذریعہ سے ایک مرتبہ اسوقت کیا جاتا جبکہ آفتاب عین زمین اور ستارے کے درمیان حائل ہوتا یعنے مقام اُ پر اور دوسری مرتبہ اسوقت جبکہ آفتاب مقام اُ پر ہوتا۔ البتہ اول الذکر تجربہ کیلئے یہ ضروری شرط ہے کہ ستارے کا عکس لیتے وقت آفتاب مکمّل طور پر حالت کسوف میں ہوتا کہ آفتاب کی تیز روشنی عکسالہ کی پلیٹ کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آئن شٹائن کے پیشین گوئی کے بعد پہلا مکمّل کسوف اگست ۱۹۱۴ء میں واقع ہوا لیکن جنگ عظیم کے باعث اس سے کچھ فائدہ نہ اٹھایا جاسکا اس کے بعد ۲۹ مئی ۱۹۱۹ء میں یہ موقعہ پیش آیا۔ اس موقعہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے انگلستان کی طرف سے دو مہمیں مشہور ہیئت دان ایڈنگٹن (Eddington) کی زیر سرکردگی روانہ کی گئیں تاکہ وہ دو ایسے مقامات پر عکس لے سکیں جو اس مقصد کے لئے موزوں ترین ہوں ایک مہم نے برازیل میں سوبران مقام پر اور دوسری نے افریقہ کے مغربی ساحل پر پرنسیل جزائر پر عکس لئے۔ علمی دنیا نتائج کا شدّت سے انتظار کر رہی تھی۔ چند مہینوں کے بعد جب مشاہدات اور تخمینہ جات مکمّل ہو چکے تو ایڈنگٹن نے دنیا کو یہ پیغام سنایا کہ آئن شٹائن کی پیشگوئی کے مطابق نہ فقط اِنحنا ثابت ہے بلکہ اس انحنا کی قیمت بھی وہی ہے جو آئن شٹائن نے پیشتر سے تخمین کر رکھی تھی۔

روشنی کے اِنحنا کو اگر مان لیا جائے تو اس سے فضا و کائنات کے متعلق جو ہمارے تصوّرات ہیں ان میں ایک عجیب وغریب انقلاب کی صورت رونما ہوتی ہے۔ جس چیز کو ہم روشنی کہتے ہیں وہ فقط فضا کی تغیّر کیفیت کا ایک دوسرا نام ہے۔ اس لئے روشنی کا اِنحنا فضا کے اِنحنا کے ہم معنی ہے۔ اس مقام پر یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ فضا کا اِنحنا

ایک بے معنی سی بات ہے۔ انسانی دماغ اس کا تصور تک پیدا نہیں کر سکتا۔ بیشک ہم اس قسم کے تصوّر کی قابلیت نہیں رکھتے اور اس ناقابلیت کے اسباب بھی موجود ہیں۔ لیکن قابلیتِ تصوّر کے عدم وجود سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم ریاضی کے ذریعہ سے ایسی چیز کا قیاس بھی نہیں کر سکتے۔ علم ریاضی ہمارے لئے ایک زائد چشم کا کام دیتا ہے جس کی وساطت سے ہم ایسی چیزوں کا قیاس کر سکتے ہیں اور ان کا علم حاصل کر سکتے ہیں جو چشمِ ظاہر بیں سے دیکھی نہیں جاسکتیں اس کو ایک مثال سے واضح کر سکتے ہیں۔ فرض کیجیے یہ زمین ہماری بالکل صاف اور چپٹ میدان ہوتی اور ہمارے بجائے اس پر ایسی ہستیاں آباد ہوتیں جنکا طول وعرض تو ہوتا لیکن بلندی یا گہرائی نہ ہوتی (مثال کے طور پر رینگنے والے جانور) تو اس صورت میں اہل زمین کو مُنحنی سطح کا کچھ علم نہ ہوتا۔ ان کے ذہن میں مُنحنی خط کا تصوّر تو پیدا ہو جاتا لیکن مُنحنی سطح کا تصوّر پیدا نہ ہو سکتا۔ کیونکہ اس تصوّر کی قابلیت گہرائی یا اونچائی کے احساس سے مشروط ہے۔ لیکن باوجود اس کے یہ ممکن تھا کہ اس نوعیت کے اہلِ زمین محض ریاضی کے وسیلہ سے مُنحنی سطح کے علم یا قیاس تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے۔ بشرطیکہ ان میں گاوس[1] (Gauss) جیسے ریاضی داں پیدا ہو جاتے۔ یہ علم انہیں مندرجہ ذیل طریقہ سے حاصل ہو سکتا تھا۔ اگر وہ لوگ سطح زمین پر چھوٹے بڑے دائرے کھینچتے اور ہر دائرہ کے محیط اور اسکے قطر کے درمیان جو نسبت[2] ہوتی اس کی تخمین کرتے تو انھیں یہ پتہ چلتا کہ چھوٹے دائروں کی

۱؎ کارل فریڈریش گاوس ۱۷۷۷ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۵۵ء میں فوت ہوا۔ گوئٹنگن (جرمنی) کی یونیورسٹی میں ریاضی کا پروفیسر تھا۔ اسنے نہ فقط فضاء کے مُنحنی ہونے کا خیال پیدا ہوا بلکہ اس نے تجربہ کے ذریعہ سے اس انحناء کے ثبوت کی کوشش بھی کی گو یہ کوشش ناکام رہی

۲؎ اس نسبت کو ریاضی کی اصلاح میں پائی (π) کہتے ہیں۔ جو یونانی زبان کا حرف ہے۔

صورت میں تو یہ نسبت ۳٫۱۴۱۵۹ کے برابر نکلتی مگر جبقدر دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا اُسیقدر یہ نسبت قیمت میں کم ہوتی چلی جاتی۔ بہرحال ان کے ریاضی دان اس نسبت کی تعیین سے اس نتیجہ پر پہنچ سکتے کہ ایک ایسی سطح بھی ہوسکتی ہے جس کے متعلق یہ کہا جاسکے کہ اس کے ہر چھوٹے بڑے دائرہ کے لئے مذکورہ بالا نسبت ایک مستقل قیمت رکھتی ہے۔ یہ علٰحدہ امر ہے کہ وہ اس قسم کی سطح کا تصور پیدا نہ کرسکتے لیکن کم سے کم ریاضی کی زبان میں اپنے اس قیاس یا علم کو ادا کرنے کی قابلیت تو حاصل کرلیتے۔ اب ایسی ہی حالت ہم سہ ابعادوالی ہستیوں کی مُنحنی فضا کے مقابلہ میں ہے یعنے باوجودیکہ ہم ایک چوتھے بُعد کو آنکھ کے ذریعہ سے دیکھنے یا اس کا تصور اور شکل ذہن میں پیدا کرنے سے قاصر ہیں لیکن ہمارے ریاضی دان اُسے جبر ریاضی کے ذریعہ سے محسوس کرسکتے ہیں۔

گویا آئن شٹائن کے نظریۂ اضافیتِ عام سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فضا منحنی ہے۔ اور چونکہ فضا میں انحنا موجود ہے اس لئے عالم کون و مکان غیر مُنتہی نہیں ہوسکتا۔ یعنے جس طرح ایک کروی سطح باوجود غیر محدود ہونے کے مُنتہی ہے ایسی طرح ہمارا عالم بھی اِنحنا مکان کیوجہ سے جس کا باعث مادہ کی موجودگی ہے انتہا رکھتا ہے گو محدود نہیں۔ اسی نظریہ کی بنا پر عالم کی جسامت اور کمیت بھی تخمین کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ ایک ہیئت دان دے (I lse Siltir) نے یہ کام انجام دیا ہے۔ اس کے تخمینہ کے مطابق عالم کا قطر قریباً ۱۰۰ ملین[1] روشنی کے سال ہے اور کل کائنات کا وزن[2] ۱۰۵۴ گرام ہے۔

---

[1] روشنی کے سال سے مراد وہ فاصلہ ہے جسے روشنی ایک سال میں طے کرتی ہے۔

[2] ۱۰۵۴ اختصار ہے اس عدد کا جو ایک کے آگے ۵۴ صفر لگانے سے ملتا ہے۔

نظریۂ اضافیت کو وجود میں لانے کا محرک اگر کوئی ایک مرکزی خیال ٹھہرایا جاسکتا ہے تو وہ حرکت مطلق کے عدم وجود کا خیال ہے۔ آئن شٹائن نے ایک بت شکن کی مانند حرکتِ مطلق کے بت کو جہاں کہیں پایا توڑنے سے دریغ نہیں کیا۔ اسراعی حرکت کو بذریعہ دعویٔ مساویت اضافی ثابت کرنے کے بعد اس کی توجہ اس نوعِ حرکت کی طرف ہوئی جسے گردشِ محوری کہتے ہیں۔ یہ حرکت دراصل کوئی نئی نوعِ حرکت نہیں بلکہ اسراعی حرکت ہی کی ایک شاخ ہے جس میں مقدارِ رفتار میں تغیر ہونے کی بجائے سمتِ رفتار میں تغیر واقع ہوتا ہے۔ کسی ایسے نظام میں جو محور پر گردش کر رہا ہو چند واقعات رونما ہوتے ہیں جن میں سے ایک مرکز گریز قوتوں کے نشوونما کا واقعہ ہے۔ یہ واقعات اس نظام کی حرکتِ مطلق کے متعلق بطور شہادت پیش کئے جاسکتے ہیں چنانچہ نیوٹن کے نزدیک گردش کے دوران میں مرکز گریز قوتوں کا رونما ہونا اس بات کی زبردست شہادت تھی کہ گردشِ محوری حرکتِ مطلق ہے۔

اس سلسلہ میں اس کا کٹورا و پانی والا تجربہ قابل ذکر ہے۔ اگر کسی کٹورے میں پانی ڈال کر گھمائیں تو شروع میں پانی جمود کے باعث کٹورے کے ساتھ ساتھ حرکت نہیں کرتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پانی کی سطح بالکل ہموار رہتی ہے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں پانی بھی کٹورے کے ساتھ گردش میں شامل ہوجاتا ہے اور اسوقت ہم دیکھتے ہیں کہ پانی مرکز سے ہٹ کر کٹورے کی دیواروں پر چڑھنے لگتا ہے۔ نیوٹن کا طریقِ استدلال یہ تھا۔ شروع میں پانی اور کٹورے کے درمیان اضافی حرکت پائی جاتی ہے اس لئے مرکز گریز قوتیں ظاہر نہیں ہوتیں۔ بعدازاں جب پانی مطلق طور پر گردش کرنے لگتا ہے تو اسوقت ان قوتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ لہٰذا مرکز گریز قوتوں کا نشوونما مطلق حرکت پر دلالت کرتا ہے۔ اس استدلال کی بنا پر نیوٹن کرۂ ارض کی گردش کا مطلق معنوں میں قائل تھا۔ کرۂ ارض پر بھی مرکز گریز قوتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ رہا یہ امر کہ انسانی جسم اِن قوتوں کو

کیوں محسوس نہیں کرتا تو اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ زمین کی گردشِ محوری کا زاویہ اسقدر کم ہے کہ اس قسم کی قوتیں ناقابلِ احساس رہ جاتی ہیں۔ البتہ نازک آلات کے ذریعہ سے ان کا وجود ثابت ہے۔ قُطبوں پر زمین کا چپٹا واقع ہونا بھی اس علت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ زمین کی گردش سے ایک اور قسم کی قوت کا نشوونما بھی واقع ہوتا ہے[1] جس کا اثر ان اجسام پر ظاہر ہوتا ہے جو زمین پر حرکت کر رہے ہوتے ہیں۔ مثلاً اس قسم کی قوتوں کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ دریا ہمیشہ بائیں کنارے کی بہ نسبت دائیں کنارے پر زیادہ توڑ پھوڑ کرتے ہیں۔

اس قسم کے تمام واقعات نیوٹن کے نزدیک زمین کی گردشِ مطلق ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ گویا کوپر نی کس (Copernicus) کے نظامِ شمسی کو ٹولمی (Ptolemy) کے نظام پر فقط ترجیح نہیں بلکہ دراصل وہی صحیح ہے۔ نیوٹن کے اس استدلال پر آئن شٹائن سے بیشتر بعض عالموں کی طرف سے اعتراض وارد ہو چکے تھے۔ ان معترضوں میں ماخ (Mach) کا نام قابل ذکر ہے۔ ماخ کے نزدیک نیوٹن کا تجربہ فقط یہ ثابت کرتا ہے کہ جب پانی برتن کی دیواروں کے مقابلہ میں اضافی طور پر حرکت کر رہا ہوتا ہے تو مرکز گریز قوتیں وجود میں نہیں آتیں لیکن یہ امر ابھی ثبوت طلب ہے کہ پانی یا کرۂ ارض یا پانی اور ستاروں کی دنیا کے درمیان اضافی حرکت سے بھی ایسی قوتیں رُونما نہیں ہو سکتیں، اگر یہی صورتِ حال ہے تو کوپرنیکس کے نظام کو ٹالمی کے نظام پر اس وجہ سے ترجیح حاصل نہیں ہے کہ قبل الذکر نظام ہی حقیقت میں صحیح ہے بلکہ فقط اسلئے ترجیح حاصل ہے کہ واقعات کی تشریح میں وہ نظام زیادہ کامیاب نظر آتا ہے۔ آئن شٹائن کا نظریہ ماخ کے اس خیال کی تائید کرتا ہوا اصولِ اضافیت کو گردش محوری پر بھی توسیع دینا چاہتا ہے۔

---

[1] اس قوت کو انگریزی میں (Coriolis force) کہتے ہیں

نظریۂ اضافیت کی رُو سے گردشِ محوری میں جن واقعات کا ظہور ہوتا ہے ان کی تعبیر یوں بھی ہو سکتی ہے کہ جس نظام کو گردش کرتا ہوا مانا گیا ہے وہ در اصل گردش نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے گرد بقیہ ستاروں کا عالم حرکت کر رہا ہے۔ اور یہ موخرالذکر کے تجاذب کا اثر ہے جو ان واقعات کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔

اب ذرا مکرر ان نتائج پر نظر ڈال لینی چاہیئے جو دعویٰ مساویت سے مُترتب ہوتے ہیں۔ اوّل تو اس دعویٰ کے ذریعہ سے اصولِ اضافیت کی توسیع اس طور سے عمل میں آجاتی ہے کہ اہمیں غیر متغیّر حرکت کے علاوہ اسراعی حرکت بھی شامل ہو سکتی ہے۔ اس سے قبل واقعات جمود سے مطلق اسراعی حرکت کے وجود پر استدلال کیا جاتا تھا۔ لیکن اب آئن شٹائن کا دعوےِ مساویت انہیں واقعات کی دیگر اجسامِ عالم کے عملِ تجاذب سے تعبیر کرتا ہے۔ اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ دعویٰ مساویت انحناءِ نور کے واقعہ کی صورت میں قرینِ صحت ہونے کی سند حاصل کر چکا ہے۔ گویا حرکتِ مطلق غیر معلوم ہے۔ اور چونکہ حرکتِ مطلق کا مفہوم مکانِ مطلق سے وابستہ ہے اِس لئے موخرالذکر بھی کوئی وجود نہیں رکھتا۔ لیکن اس سلبی پہلو کے علاوہ دعویٰ مساوّیت ایجابی پہلو بھی رکھتا ہے۔ اس دعویٰ نے اسراعی حرکت اور تجاذب کے درمیان جو اس سے پیشتر دو مختلف واقعاتِ فطرت سمجھے جاتے تھے ایک رشتہ قائم کر دیا ہے جس کی بنا پر آئن شٹائن کو نیوٹن کے نظریۂ تجاذب میں ترمیم کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی ہے۔ گویا نظریۂ اضافیت عام ایک معنی میں نظریۂ تجاذب ہے۔ اس نئے نظریۂ تجاذب کو جو اعلیٰ ریاضی کے پیچیدہ ضابطوں اور مساوات کا مجموعہ ہے الفاظ میں ادا کرنا ناممکن ہے۔ البتہ جو چیز الفاظ میں ادا کی جا سکتی ہے وہ اصولی اختلاف ہے جو آئن شٹائن اور نیوٹن کے نظریۂ تجاذب کے مابین پایا جاتا ہے۔ نیوٹن نے اپنے نظریۂ تجاذب کی عمارت دو کلیوں کی بنا پر کھڑی کی تھی۔ ایک کُلیۂ تجاذب اور دوسرا کلیۂ حرکت۔ کلیۂ تجاذب کی

رُو سے دو جسموں کے درمیان جو قوّتِ تجاذب عمل کرتی ہے وہ ان جسموں کی کمیتوں کے حاصل ضرب کے بالراست اور ان کے درمیانی فاصلہ کے مربع کے بالعکس متناسب ہوتی ہے۔ کلیۂ حرکت کی رُو سے اگر کسی جسم پر کوئی قوت عمل نہ کر رہی ہو تو وہ جسم یا تو حالتِ سکون میں رہتا ہے یا خطِ مستقیم میں غیر متغیر رفتار کے ساتھ حرکت جاری رکھتا ہے۔ لیکن جب اس جسم پر کوئی قوّت عمل کر رہی ہو تو اس میں اسراع پیدا ہوتی ہے جو قوّت اور جمودی کمیّت کے حاصل تقسیم کے برابر ہے۔

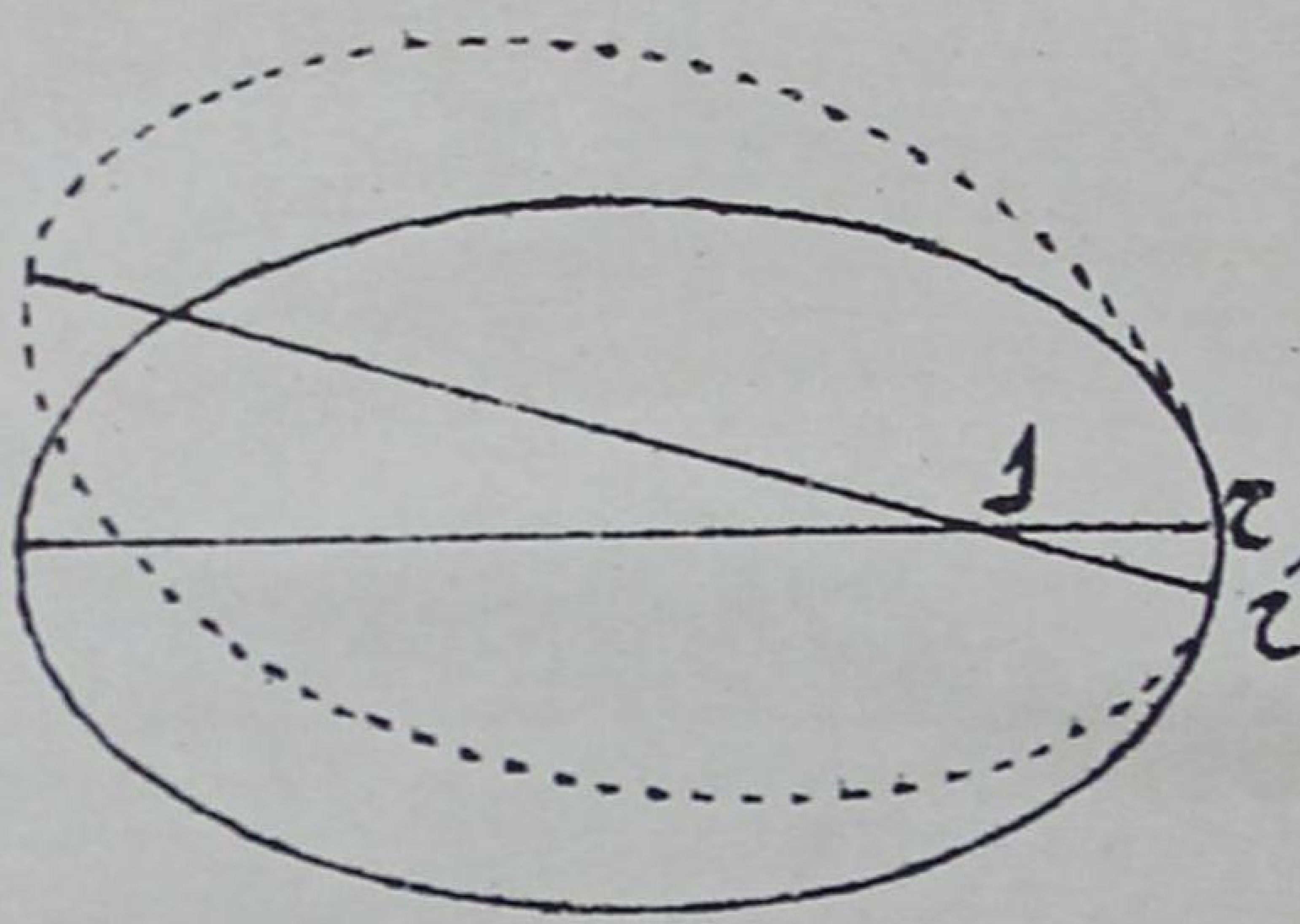
نیوٹن نے ان دونوں کلیوں کو ریاضی کے عمل سے ایسی صورت دی کہ ان کی مدد سے کسی فلکی جسم کی حرکت تخمین کی جاسکتی ہے بشرطیکہ وہ قوّت جس کے زیر اثر وہ جسم حرکت پذیر ہو معلوم ہو یا بالعکس وہ قوّت تخمین کی جاسکتی ہے جو کسی جسم کی معلومہ حرکت کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ عملی طور پر اجسامِ فلک کی حرکت کے تعین کرنے میں نیوٹن کے نظریہ کو جو کامیابی حاصل ہوئی وہ بلا شبہ ایسی تھی کہ اس کا لحاظ کرتے ہوئے نظریۂ تجاذب کو حکمتِ جدید کا اعلیٰ ترین کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اس میں مکان و حرکتِ مطلق کے متعلق ان اصولی و فلسفیانہ اعتراضات کی گنجائش نہ ہوتی جن کا ذکر پیشتر کیا جاچکا ہے تو ایسی عظیم الشان عمارت کو گرانے اور اس کی جگہ پر ایک دوسری عمارت کو کھڑا کرنے کی کبھی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔

ہم اس مضمون کے پہلے حصہ میں دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح اصولِ اضافیت کی خاطر آئن شٹائن نیوٹن کے علم الحیل کو ترک کر دینے پر مجبور ہوا۔ اب دعویٔ مساویت کو صحیح تسلیم کر لینے کے بعد ایک طرف تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسراعی حرکت سے ایک قسم کا میدان جمود پیدا ہوتا ہے جو میدانِ تجاذب کے مساوی ہے اور دوسری طرف یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ میدانِ تجاذب کی قرب میں یا فضا میں انحنا رواقع ہوتا ہے۔ پہلے واقعہ سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ دو اجسام کے مابین جو قوتِ تجاذب رُونما ہوتی ہے وہ فقط ان اجسام کی کمیّت اور درمیانی فاصلہ پر ہی انحصار نہیں

رکھتی جیسا کہ نیوٹن کا کلیہ تجاذب بیان کرتا ہے بلکہ اس پر اجسام کی حرکت کا بھی اثر پڑتا ہے۔ دوسرے واقعہ سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ میدانِ تجاذب کے قرب وجوار میں چونکہ فضار میں انحنا موجود ہے ہے اس لئے ایسے مقام پر اگر کوئی ایسا جسم موجود ہو جو کسی قوت کے زیر اثر نہ ہو تو وہ خطِ مستقیم میں حرکت نہیں کریگا (جیسا کہ نیوٹن والا کلیہ حرکت بیان کرتا ہے) بلکہ ایک ایسے خط میں جو اس قسم کی کروی فضار کے لحاظ سے سب سے چھوٹا خط ہوگا۔ (منحنی فضار میں خط مستقیم کا مفہوم وہ نہیں رہتا جو فضار اقلیدس میں اس کا مفہوم ہے)

ان ترمیم شدہ کلیوں کو آئن شٹائن کے نئے نظریہ تجاذب کی بنیاد سمجھنا چاہیئے۔ اس لحاظ سے نیا نظریہ پرانے نظریہ سے کم سے کم نظری حیثیت میں زیادہ جامع اور صحیح ہے۔ عملی حیثیت سے دونوں میں کچھ زیادہ اختلاف نہیں کیونکہ کسی فلکی جسم کی حرکت کی متعلق دونوں نظریوں سے جو نتائج اخذ کئے جاتے ہیں ان میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ اسقدر کم ہے کہ اکثر حالتوں میں نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ البتہ ہیئات کا ایک ایسا واقعہ ضرور ہے جس کی تشریح نیوٹن کے نظریہ تجاذب سے نہیں ہوسکتی لیکن جو آئن شٹائن کے نظریہ کی روشنی میں بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے۔ کیپلر (Kepler) کے کلیہ کے مطابق نظام شمسی کے سیارے آفتاب کے گرد اس طرح حرکت کرتے ہیں کہ ان کے خطِ حرکت کی شکل قطعِ ناقص کی سی ہے جس کے ماسکہ میں آفتاب موجود ہے۔ اس قطعِ ناقص کے اُس نقطہ کو جو آفتاب سے قریب ترین ہے (Perihelion) نقطہ حضیض کہتے ہیں (نقطہ ح شکل نمبر ۴) ہیئت دانوں پر یہ بات بھی روشن تھی کہ سیارہ اپنی حرکت کے دوران میں ہمیشہ ایک ہی قطعِ ناقص پر قائم نہیں رہتا بلکہ کچھ عرصہ کے بعد اس کا خط حرکت ایک اور قطع ناقص بناتا ہے جو پہلے قطع ناقص سے اُسی سطح میں بنا ہوا ہوتا ہے (دیکھو شکل نمبر ۴) اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس سیارہ کا نقطہ حضیض

Perihelion تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اس واقعہ کی علت ان کششوں کو قرار دیا جاتا ہے جو اس سیارہ پر آفتاب کے علاوہ دوسرے سیاروں کی جانب سے عمل میں آتی رہیں۔



شکل نمبر ۴

سوائے عطارد (Mercury) کے دوسرے سیاروں کے نقطہ حضیض کی حرکت اسقدر کم ہے کہ اُسے نظرانداز کیا جاسکتا ہے لیکن جب نیوٹن کے نظریۂ تجاذب کے ذریعہ سے متذکرہ بالا علت کی بنا پر عطارد کے نقطہ حضیض کی حرکت تخمین کی جاتی ہے تو تخمین کردہ حرکت اس حرکت سے بہت کم نکلتی ہے جو مشاہدہ میں آتی ہے۔ برعکس اس کے جب آئن شٹائن کے نظریۂ تجاذب کے ذریعہ سے یہ حرکت تخمین کیجاتی ہے تو مُشاہدہ حرکت کے مساوی نکلتی ہے۔ یہ واقعہ نئے نظریۂ تجاذب کی شہادت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

جاپان

(ترجمہ از نثر انگریزی نوشتہ نواب مسعود جنگ بہادر)

طلوع آفتاب کی سرزمین میری نظر میں ایشیا کا مطلع آرزو ہے۔ اس کی پھولوں سے لدی ہوئی وادیوں میں اور اس کے زمردیں جزائر کے جھکوں میں مجھے وہ انشراحِ صدر ہوا کہ ماضی اور حال و مستقبل ایک نظر آنے لگے۔

آج ایشیا پر یاس کی تیرگی چھائی ہوئی ہے۔ لیکن میرا وجدان تیز اس پردۂ سیاہ کے پار گزر گیا اور میں نے حسن و جمال کی وہ تصویر دیکھی جس کے اندازۂ عظمت و جلال سے انسان کی چشم فانی ابھی تک نامحرم ہے۔ شبِ ماہ میں مقدس فوجی یا ماکمال دلارائی کے باوصف، وہ شان و خوبی نہیں رکھتا جو میرے منظر تصوّر میں تھی۔

ایک مرتبہ جاپان کے ایک جنگل میں کہ عہد گزشتہ کی یادگاروں سے مملو ہے، میرے کانوں میں بزرگان پیشین کی روحوں کی صدائیں سرسرانے لگیں۔ وہ صدائیں جو کہتی تھیں کہ "اے وہ کہ تو ہماری سرزمین میں ایک عزیز نووارد ہے اپنے مضطرب دل کو صبر و سکون دے۔

وہ اذیتیں جو آج تیرے حق میں سوہانِ روح ہیں، ہم اُن سے لذّت آشنا ہیں کہ کبھی وہ ہمیں بھی تڑپا چکی ہیں۔ فراموش نہ کر کہ صبر مشرق کا ورثہ بزرگ ہے اور صبر و پرخلوص عمل ہی میں وہ طاقت پنہاں ہے جس کے ذریعے تیرے ہم قوم وہ چیز پیدا کریں گے جسے پیدا کرنے کے متمنّی ہیں۔ یہ تیرا برگزیدہ ہموطن بودھ ہی تھا جس نے دنیا کی ساری بیماریاں کھونے کا یہ نسخہ اکسیر ہمیں سکھایا اور آج اسی کو ہم تجھے یاد دلاتے ہیں کہ ظاہرا تیری قوم نے اُسے کمال بے پروائی سے بھلا دیا ہے۔"

صدائیں رک گئیں میری انکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں مغرب کی طرف تکنے لگا جہاں میرا وطن واقع تھا اور جہاں آفتاب ایک گُدنی غبار میں آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا۔

تحفۂ سامی

(صدر یار جنگ بہادر صدر صدور سرکار عالی)

شاہزادۂ سام مرزا صفوی فرزند شاہ اسمعیل صفوی نے شعرائے فارسی کا تذکرہ لکھا ہے جس کا نام تحفہ سامی ہے۔ سام مرزا کا تخلص سامی تھا۔ دیباچہ میں لکھا ہے کہ جن شعرائے مابعد کا ذکر تذکروں میں نہیں آیا ہے۔ (مثلاً مجالس النفائس و بہارستان) اون کے حالات کتابوں میں نہیں ملتے۔ آج زبانوں پر ہیں کل مٹ جائینگے اس لئے یہ تذکرہ شعرائے موصوف کے حالمیں لکھا ہے۔ اس میں سات صحیفے ہیں ایک ذیل صحیفہ اوّل شاہ اسمعیل اور اون کی اولاد کے ذکر میں صحیفہ دوم دیگر سلاطین و شاہزادگان سادات عظام و علمائے اعلام صحیفہ سوم وہ واجب التعظیم بزرگ جو شاعر تو نہ تھے مگر کبھی کبھی شعر کہتے تھے چہارم وزرا و اہل قلم پنجم شعرائے سلم۔ ششم طبقہ ترکان و شعرائے مقرر ایشاں ہفتم سائر عوام ذیل۔ خاتمہ جس میں شاہزادہ نے اپنا کلام بھی لکھا ہے۔

یہ تذکرہ شاہ طہماسپ کے عہد میں لکھا گیا تھا ضمناً بعض شعرا کے حالات میں تشریح کی ہے کہ سنہ ۹۵۷ھ میں زیر تالیف تھا۔ یہ تذکرہ اگرچہ ضخیم نہیں۔ مگر حالات کے اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔ قلت حجم کی تلافی یوں بھی ہوجاتی ہے کہ عبارت آرائی سے پاک ہے۔ ساری عبارت میں

حال ہے یا کلام پر رائے انتخاب بھی کثیر نہیں۔ قلیل ہے مگر تازہ لسانی شیرازی کی صحبت و کلام سے بہت فیض پایا تھا۔ سخن فہمی جملہ جملہ سے عیاں ہے۔ اخلاق میں شاہزادگی ہے تعلی کا نام نہیں اوس عہد کے علمی اثر نے جو نقود اعلیٰ سے ادنیٰ تک کیا تھا وہ اس تذکرہ سے صاف عیاں ہے۔

سام مرزا کا سلیقہ ادب شاہانہ ہے۔ بے لاگ رائے لکھتا ہے انتخاب لاجواب کرتا ہے۔ کثرتِ کلام یا شاعر کے طمطراق سے مرعوب نہیں ہوتا صحیفہ ہفتم سے واضح ہے کہ ذوق ادب ہر طبقے اور ہر پیشے میں ساری تھا۔ لوہار۔ حجّام۔ خیاط۔ قصّہ خوان۔ معمار۔ قلندر۔ پہلوان۔ طبّاخ۔ کمانگر۔ چینی فروش۔ کاغذ فروش۔ بزاز۔ باغبان۔ تاجر۔ نقاش۔ قصاب۔ عطار۔ زرگر۔ بیلدار۔ تاج دوز۔ کلہ پز۔ قفل گر۔ کبابی۔ صراف۔ کرمان فروش کحال۔ خوردہ فروش۔ شمشیر گر۔ رمال۔ اتنے پیشہ وروں کا ذکر اس تذکرہ میں ہے۔ بعض ان میں سے خطاط بھی تھے بعض دو زبانوں ترکی و فارسی کے شاعر۔ اس کے ساتھ اپنے اپنے فن میں ماہر۔ استاد نوری قفل گر کے حال میں لکھا ہے کہ اس نے بارہ فولادی قفل ایسے نازک بنائے تھے کہ ایک پستے کے پوست میں آجاتے تھے۔ اور سب میں کنجی لگتی تھی۔ اس کا پتا بھی لگتا ہے کہ بڑی عمر میں بھی لوگ علم سیکھتے تھے۔ چنانچہ مولانا عشقی کے حال میں لکھا ہے کہ چالیس برس کی عمر میں پڑھنے کا شوق ہوا اور بڑی محنت سے حاصل کیا یہ تذکرہ ۹۸۶ھ کا لکھا ہوا ہے۔ یعنی تصنیف کے کم و بیش انتیس[۲۹] برس بعد۔ اصل کی نقل ہو یا نقل کی نقل۔ رام پور اور حیدرآباد کے کتاب خانوں میں اس کا کوئی نسخہ نہیں۔ نفیس لکھا ہوا ہے۔ جا بجا غلط ہے بہت سے نام چھوٹ گئے ہیں جتنے سلاطین اور شاہزادوں کا ذکر ہے سب کے سب علم پرور اور ادب دوست تھے۔ جگہ خالی ہے۔ غالباً شنگرف نے لکھی کی ابتدا میں (اندازاً) دیباچہ کے دو ورق گم ہیں۔ سیاسی اثر سے جا بجا سیاسی و دینی خیالات ایسے ظاہر کئے ہیں جو ایک ادبی تذکرے میں نہ ہوتے تو بہتر تھا۔

انتخاب کے نمونے ۔ سام مرزا نے متاخرین کی خصوصیت یہ لکھی ہے کہ لطافت و نزاکت کلام میں وہ متقدمین سے گوئے سبقت لے گئے ہیں ۔ اس صفت کا ظہور انتخاب میں پورا پورا ہے ۔ فارسی شاعری اسی میں سارے عالم میں ممتاز ہے ۔ میر معزالدین محمد ؎

درون حلقۂ زلف تو رخ نمایان ست وگرنہ در دل شب آفتاب یعنی چہ

مرزا اشرف جہاں ۔ اس شعر کی لطافت و نزاکت ملاحظہ ہو ؎

بیار من سخن از حال زار من مکنید بدیں بہانہ تکلم بیار من مکنید

ایک مثنوی کا انتخاب یہ تین شعر ہیں ۔ مرزا قاسم (شاہنامہ صفت باغ) ؎

صنوبر زدہ شانہ گیسوئے خویش کشیدہ ولے عالمی سوئے خویش

عیاں شاخ گل زاب روشن ضمیر چو قد بتاں در لباس حریر

سہی سرو آب از درخشندگی بود خضر و سر چشمہ زندگی

لیلیٰ مجنوں (سحر حلال کی مثل ہے) مجنوں اونٹ سے کہتا ہے:

گلزار جہاں تہی کن از خار کان غیرت صد ہزار گلزار

روزے کہ ببوئے گل شود دست خارے نزند بدامنش دست

بیماری لیلیٰ (" " " ") ؎

شد ساعد سیم نازنینش چوں نال قلم در آستینش

شد مہرۂ پشت آں سمن بر چوں رشتہ دُر زپائے تا سر

خسرو شیریں سام مرزا کے نام سے کہی تھی ۔ ایک اور مثنوی میں حسینان ہرات کی تعریف ہے ؎

بتانش بردے چو غنچہ و داغ دل گل چیدہ پروردہ در باغ دل

فلک خواست آشفتہ چوں موے شاں | کہ نقشے کشد از دو ابروے شاں
بدعوی یک ابروے مہ راں نگاشت | خجل گشت و ابروے دیگر گذاشت

میر کمال الدین حسین خلقی ؎

اے گرد کوے یار دمے از ہوا نشین ؎ | مہمان مردماں شو و در دیدہا نشیں

عشقی (چالیس برس میں علم سیکھا) ؎

شادم کہ دانمم سگ کوئے تو میکشد | وین شادی دگر کہ بہ سوئے تو میکشد

جمالی (کرپاس فروش) ؎

دستم بدست آں صنم مست دادہ است | خوش دولتیست اینکہ مرا دست دادہ است

بنائی (رمال) ؎

رفت در خرگہ مہ من مرغ دل حیراں بماند | شمع در فانوس شد پروانہ سرگرداں بماند

مقطی (معمار) ؎

زلف خم در خم او دیدم و از کار شدم | باز در سلسلہ عشق گرفتار شدم ؎

نوری (کحال) ؎

ہلال خواست شود حلقہ درش شب عید | ز دور نسبت خیالے ولی بہم نرسید

جاروبی (بابا فغانی) ؎

چوں باد ز کوے تو بر آشفتم و رفتم | گردے ز دل مدعیاں رفتم و رفتم

جواب جاروبی ؎

جاروبی ام و بستہ کمر از پے خدمت | ہر شام و سحر خاک درت رفتم و رفتم

شکیبی (زرگر) ؎

بہر طریق کہ باشم خلاف رائے تو باشد کسے چہ کار کند کاں بمدعائے تو باشد

ذاتی (کبابی) ؎

پیوستہ بدل بار غمِ یار کشیم در دیدہ ہمہ منتِ دیدار کشیم
جانم بلب آمد و تن از غم کاہید اینہا ہمہ از دوریٔ دیدار کشیم

ولی (خیاط) ؎

کسے کہ دلربائے خویش را با دیگرے بیند درون سینہ ہر دم ناوکے با خنجرے بیند
آں آتشیں کہ بود در جگر مرا ہر لحظہ سوزد آہ بہ نوعے دگر مرا

مردی (علاقہ بند) ؎

سواد خط تو دیوانہ ام بدینساں کرد سیہ بہار و باغ مرا پریشاں کرد

حاصلی (ابریشم فروش) ؎

جز خیال دہنت ہیچ نیاید بنظر دہن تنگ تو اے شوخ خیالست مگر

فیضی (تکمہ بند) ؎

اے دلم با غم عشق تو ز ہر غم فارغ منم و عالم غم در غمِ عالم فارغ

غزالی (طباخ) ؎

بے گل روئے تو نرگس چشم تر دارد بسے غنچہ بے لعل لبت خوں در جگر دارد بسے

خواجہ فتح اللہ (تاجر) ؎

من کہ چوں نے زغمت چہرۂ زردے دارم گر بنالم عجبے نیست کہ دردے دارم

کیفیت

مجلس مذاکرات علمیہ حیدرآباد

دکن کے بیدار مغز فرمان روا اعلیحضرت سلطان العلوم میر عثمان علیخاں بہادر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی عدیم المثال علم پروری اور شاہانہ فیاضی کے طفیل سے "بلدہ حیدرآباد" رفتہ رفتہ ہندوستان کا بڑا علمی مرکز بنتا جاتا ہے۔ جہاں مختلف علم وفن کے علماء اور ماہرین اور اکنافِ ہند کے بہت سے مشہور ادیب اور مصنّفین جمع ہو رہے ہیں اور اطمینان کے ساتھ بیش بہا علمی خدمت انجام دے رہے ہیں لیکن علمی کاموں کے شوق اور ہمت کے لئے، نیز وسیع تر پیمانہ پر کوئی کام کرنے کے واسطے ضروری ہے کہ اہل علم آپس میں اکثر ملاقات اور مبادلہ خیالات کرتے رہیں اور ایسے کام ملکر کرنے کی صورتیں نکالیں، جو انفرادی کوشش سے اتمام کو نہیں پہنچ سکتے۔ ہم خیال احباب کی کبھی کبھی یکجائی بھی بذات خود ایسی غرض مشترک ہے کہ حیدرآباد جیسے پھیلے ہوئے شہر میں بغیر اہتمام کے پوری نہیں ہوسکتی اور انھیں وجوہ سے بعض حضرات کو بارہا خیال آیا کہ کسی مناسب مقام پر ایسا مرکز بنایا جائے جہاں علمی مذاق کے احباب باہمی ملاقات و مذاکرات کا لطف اٹھائیں۔ نواب صدر یار جنگ بہادر شروانی (صدر الصدور سرکار عالی) ہم سب کے دلی شکریے

کے مستحق ہیں کہ اس معاملے میں سب سے زیادہ دلچسپی لیتے رہے اور ممدوح کی تحریک سے ہی ماہ جمادی الآخرہ ۱۳۴۳ھ ڈسمبر ۱۹۲۴ء میں چند علم دوست احباب کا ایک جلسہ نظامت آثار قدیمہ کے دفتر میں منعقد ہوا اور بحث و مشورہ کے بعد بلدہ حیدرآباد میں ایک ایسی انجمن کی ضرورت کو تسلیم کیا گیا جس میں علمی مذاق کے لوگ کبھی کبھی جمع ہوتے ہیں۔

آئندہ جلسوں میں جن کی مختصر کیفیت آگے آتی ہے۔ اس انجمن کا نام مجلس مذاکرۂ علمیہ قرار دیا گیا اس کے ارکان کی تعداد محدود کر دی گئی اور طے ہوا کہ سر دست مجلس کے جلسے کم و بیش ہر مہینے میں ایکمرتبہ باری باری ارکان مجلس ہی کے مکان پر منعقد ہوتے رہیں اور ہر جلسے میں کسی علمی موضوع پر تقریر یا کوئی مضمون سنایا جائے۔ یہی مضامین جو گذشتہ سال مجلس کے جلسوں میں پڑھے گئے تھے اب ایک مجموعے کی صورت میں طبع کئے جا رہے ہیں اور مضامین کی ترتیب وہی رکھی ہے جس ترتیب سے انھیں مجلس میں پڑھا گیا تھا۔

ہمارا یہ پہلا مجموعہ مضامین کی کثرت یا تنوع کے اعتبار سے کچھ بہت بلند پایہ نہیں ہے لیکن اُمید رکھنی چاہیئے کہ جس نسبت سے ارکان کی مجلس کے ساتھ دلچسپی بڑھے گی۔ اسی قدر ہم زیادہ ضخیم اور بہتر سالانہ مجموعہ شایع کر سکیں گے۔ اور مجلس مذاکرہ کے دائرہ عمل میں بھی رفتہ رفتہ اتنی وسعت پیدا ہو جائیگی کہ وہ صحیح معنی میں علمی تحقیقات و اشاعت کا ایک بڑا مرکز بن جائے۔ کیونکہ گو ہمارے بعض احباب کو اپنی ذمہ داری بڑھانے میں تامّل ہے اور وہ اس مجلس کو محض دوستوں کی صحبت بے تکلف اور تھوڑی دیر کی تفریح و تفنن کا ذریعہ رکھنا چاہتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ ایسی معصوم عیاشیاں بھی کسی جفاکش اور آسودہ حال قوم کے لئے جائز ہوں تو ہوں ہماری نکمّی اور پس ماندہ قوم کو زیب نہیں دیتیں۔

اس مجموعے میں چند قلمی اور نادر کتابوں پر مفید تبصروں کے علاوہ جغرافیہ اندلس پر

ایک دلچسپ مضمون ہے جسے مخدومی مولوی محمد عنایت اللہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے اور اس موضوع پر جو سالہا سال ان کے زیر تحقیقات و مطالعہ رہا ہے لکھنے کا ان سے زیادہ اہل شاید کوئی نہ ہوگا۔ ایک مضمون، جدید نظریۂ اضافیت پر ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر مظفر الدین صاحب قریشی نے تیار کیا اور مجلس کے دو جلسوں میں پڑھا تھا اس موضوع پر خود یورپ کی زبانوں میں ابھی تک بہت کم مضامین یا کتابیں ایسی چھپی ہیں جن میں نظریہ اضافیت کے دقائق کو عام فہم طریق پر بیان کیا گیا ہو۔ اور اس اعتبار سے اردو میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ مقالہ نہایت قابل قدر ہے۔

افتتاح کے بعد جس کا اوپر ذکر ہوا، ہماری مجلس کا دوسرا جلسہ ماہ رجب ۱۳۴۳ھ میں نواب مسعود جنگ بہادر کے مکان پر منعقد ہوا جس میں نواب صاحب نے جاپانی قوم کی بعض خصوصیات اور اسباب ترقی پر ایک مفید و دلچسپ تقریر فرمائی قلم بند نہ ہونے کے باعث افسوس ہے کہ ہم اسے اپنے مجموعۂ مذاکرات میں شامل نہ کر سکے۔ تاہم جلسے کی روئداد کے ساتھ اس تقریر کی ایک مختصر یادداشت لکھ لی گئی تھی۔ اسے ذیل میں نقل کر دیا جاتا ہے۔ نواب مسعود جنگ نے بیان کیا کہ "جاپان میں قومی اتحاد کی سب سے قوی وجہ تو ظاہر ہے کہ جزیرہ ہونے کے باعث یہ ملک بیرونی حملوں سے محفوظ اور یہاں کی نسل غیر مخلوط رہی لیکن ایک اور عجیب سبب جس پر نواب مسعود جنگ نے بار بار زور دیا جاپانیوں کی بادشاہ پرستی ہے جس نے انھیں ایک نقطے پر متحد کر رکھا ہے۔

جاپانی بادشاہوں کی حب وطن اور ایثار بھی قابل تعریف ہے کہ انھوں نے اس زمانے میں خود اپنے شخصی اختیارات سے دست برداری کر لی اور اب وہ کوئی کام مجلس شوریٰ کی رائے کے بغیر اپنی مرضی سے نہیں کرتے۔

جاپانیوں کا اصطلاحی معنی میں کوئی مذہب نہیں۔ لیکن انھیں حیات بعد الممات کا پختہ یقین ہے اور وہ ارواح کو زندوں کی شکل متصرف جانتے ہیں۔ اس عقیدے نے ان کو موت سے بالکل نڈر اور بے پروا بنا دیا ہے اور اس نڈری کا دوسرا سبب نواب مسعود جنگ بہادر نے یہ بیان فرمایا کہ جاپان زلزلوں آتش فشانیوں اور آفات سماوی کا ملک ہے ان آفتوں سے وہاں لاتعداد ناگہانی موتیں واقع ہوتی رہتی ہیں اور انسانی زندگی کی بے حقیقتی اور ناپائداری کا نقش لوگوں کے دل پر اس قدر صاف اور واضح طور پر جم گیا ہے کہ اب وہ زندگی کی مطلق پروا نہیں کرتے اور معمولی بات پر جان دے دیتے اور خودکشی کر لیتے ہیں۔ جو ان کے قانون میں جائز فعل ہے"

مجلس کا تیسرا جلسہ ماہ شعبان ۱۳۴۳ھ میں نواب صدر یار جنگ بہادر کے مکان پر ہوا جلسے میں میجر لطافت حسین خاں صاحب کی کتاب تاریخ ایران قدیم کا مسودہ اور تزک بابری کے مطبوعہ ترجمہ اردو کے ساتھ مولوی معشوق حسین صاحب کے قلمی اور ناتمام ترجمہ "بابر نامہ" (مسنر بیورج) کا ایک حصہ رائے کے لئے پیش ہوا اور مولانا عبداللہ العمادی اور مولوی سید ابراہیم صاحب رضا سے استدعا کی گئی کہ وہ ان پر تبصرہ فرمائیں۔ پھر جلسہ میں تاریخ تاج المآثر پر وہ تحریر پڑھی گئی جو اس مجموعے کا پہلا مضمون ہے۔

مجلس کا چوتھا جلسہ ماہ شوال میں نواب محمد یار جنگ کے مکان پر ہوا اور اس میں نواب صدر یار جنگ بہادر شروانی نے اپنا دلچسپ مضمون جاویدان خرد پر پڑھا جو اس مجموعے کا دوسرا مضمون ہے۔

مجلس کے پانچویں ماہانہ جلسے میں ڈاکٹر مظفر الدین صاحب قریشی نے آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت پر اپنے پُرمغز مضمون کا پہلا حصّہ اور مولوی عبدالباری صاحب ندوی نے

اس موضوع پر کہ قرآن وحدیث کی رُو سے "علم" کا صحیح مفہوم کیا ہے، ایک دلچسپ وبحث انگیز تقریر کی۔

تنگی وقت اور مباحثے کی طوالت کے باعث یہ مضمون اتمام کو نہ پہنچ سکا اور ابھی تک ناتمام ہے لیکن امید ہے کہ ہم اپنے آئندہ مجموعے میں اس کو شائع کرسکیں گے۔

مجلس کے چھٹے جلسے میں جو مولوی محمد عنایت اللہ صاحب کے مکان پر منعقد ہوا اس تجویز پر دیر تک بحث ہوتی رہی کہ آیا مجلس مذاکرہ کو قدیم اور غیر مطبوعہ فارسی کتب کی تصحیح واشاعت کا کام اپنے ذمے لینا مناسب ہوگا یا نہیں۔ اکثر حضرات اس تجویز کے مؤید تھے لیکن چونکہ مجلس مذاکرہ بزمِ احباب کی نوعیت رکھتی ہے لہذا اصولاً اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ مجلس کی طرف سے جو کام کیا جائے اس سے ایک رکن کو بھی اختلاف نہ ہو چنانچہ کامل اتفاق رائے نہ ہونے کے باعث، مذکورہ بالا تجویز کو ترک کردیا گیا۔

مجلس کا ساتواں جلسہ ماہ صفر ۱۳۴۴ھ میں مخدومی مولوی محمد حسن صاحب بلگرامی کے مکان پر ہوا اور اس میں مولوی محمد عنایت اللہ صاحب ناظم دارالترجمہ نے جغرافیہ اندلس پر اپنا دلچسپ مضمون پڑھا جو اس مجموعے کا تیسرا مضمون ہے۔ پھر نواب صدر یار جنگ بہادر نے اپنی ایک پرلطف اردو غزل سُنائی۔

اس جلسے میں ۲ نئے رکن منتخب کر کے مجلس کی مقررہ تعداد پوری کرلی گئی۔

مجلس کے آٹھویں جلسے میں جو مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ کے مکان پر منعقد ہوا ڈاکٹر مظفر الدین صاحب قریشی نے "نظریہ اضافیت" کا باقی ماندہ حصہ پڑھا اور دیوار پر شکلیں کھینچکر بعض دقیق مسائل بہت خوبی سے سمجھائے۔

نویں اور دسویں جلسے میں کوئی نیا مضمون نہیں پڑھا گیا لیکن مختلف مباحث پر بہت دلچسپ

گفتگو ہوتی رہی، نواب حیدر یار جنگ طباطبائی نے اپنا ایک مطبوعہ مضمون "حرکت" پر حاضرین کو سنایا مگر یہ چھپ چکا ہے اس لئے اس مجموعے میں دوبارہ نہیں چھاپا گیا۔ البتہ نواب مسعود جنگ بہادر کی شاعرانہ نثر "مجاپان" پر جو انھوں نے انگریزی میں تحریر فرمائی تھی، ترجمہ کر کے ان مضامین میں شامل کر لی گئی ہے۔

۱۹۲۵ء کا آخری جلسہ ماہ جمادی الآخرہ میں نواب صدر یار جنگ بہادر کے مکان پر ہوا جس میں ممدوح نے تذکرہ "تحفہ سامی" پر وہ تبصرہ حاضرین کو سنایا جو اس مجموعہ کا آخری مضمون ہے مولوی عبدالقادر مرحوم صدر صدور کے قلمی روزنامچے کے متعلق گفتگو ہوتی رہی اور ارکان مجلس نے رائے دی کہ یہ نادر و مفید کتاب چھاپ دی جائے۔ یہ بھی طے ہوا کہ مجلس کے مذاکرات کا پہلا مجموعہ دار الطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی ہی میں چھپوا کر (محدود تعداد میں) شائع کر دیا جائے۔

اس اجمالی روئداد میں راقم الحروف نے بعض جزئیات کو جیسے آمد و خرچ کا حساب وغیرہ درج کرنا ضروری نہیں سمجھا لیکن اس کی تفصیلی کیفیت ہر ششماہی پر مجلس میں پیش ہوتی رہی ہے۔ آخر میں نواب صدر یار جنگ بہادر خسروانی کے شکریہ کیساتھ جنکی تحریک و توجہ سے قیام مجلس میں بہت کچھ مدد ملی اُن صاحبوں کا جنھوں نے ہمارے لئے مضمون تحریر فرمائے، اور مولوی غلام یزدانی مولوی عبداللہ العمادی اور مولوی عبدالباری صاحب کا جن کے مشوروں سے مجھے ہمیشہ استفادے کا موقع ملتا رہا، شکریہ ادا کرتا ہوں اسی طرح نواب محمد یار جنگ اور نواب حیدر یار جنگ طباطبائی ہمارے خاص شکریہ کے مستحق ہیں کہ مصروفیت اور پیرانہ سالی کے باوجود مجلس کے جلسوں میں نہایت شوق و پابندی سے شرکت فرماتے رہے فقط

خاکسار

مورخہ ۱۵ رجب ۱۳۴۴ھ

سید ہاشمی

معتمد مجلس مذاکرہ علمیہ حیدرآباد

فہرست ارکان مجلس

(۱) نواب صدر یار جنگ بہادر شروانی
(۲) نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات
(۳) نواب محمد یار جنگ بہادر
(۴) نواب حیدر یار جنگ بہادر طباطبائی
(۵) مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ
(۶) مولوی سید محمد حسن صاحب بلگرامی
(۷) مولوی محمد عنایت اللہ صاحب ناظم دار الترجمہ
(۸) مولوی حمید احمد صاحب انصاری مستجل
(۹) مولوی عبد اللہ العمادی صاحب ناظر کتب مذہبی
(۱۰) مولوی عبد الحق صاحب پروفیسر عثمانیہ کالج
(۱۱) مولوی مناظر احسن صاحب پروفیسر عثمانیہ کالج
(۱۲) مولوی عبد الباری صاحب ندوی " "
(۱۳) ڈاکٹر مظفر الدین صاحب قریشی " "
(۱۴) مولوی سید ابراہیم صاحب ندوی رکن دار الترجمہ
(۱۵) سید ہاشمی رکن دار الترجمہ (معتمد مجلس مذاکرہ علمیہ)

اطلاع

اس مجموعے کی عام اشاعت مقصود نہیں ہے۔ تاہم چند نسخے ارباب ذوق کیلئے رکھ لئے گئے ہیں اور بقیمت عصا فی نسخہ معتمد مجلسِ مذاکرہ۔ دارالترجمہ حیدرآباد کے پتہ سے مل سکتے ہیں۔